روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس
(اقبال)

ہوس

(ایک ناولٹ)

عزیز احمد

مکتبہ جدید، لاہور

پہلی فضا

(۱)

اس رات کو چاندنی تھی۔ بہت شفاف دل پر اثر کرنے والی چاندنی نہیں، دھندلی سی چاندنی۔ اب یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ چاندنی دھندلی تھی یا گزرے ہوئے زمانے سے میری یاد اتنی دھندلی ہو گئی ہے۔ کہ مجھے اس رات کی چاندنی بھی دھندلی یاد آتی ہے۔

رات کے ۹ بجے کے قریب زلیخا کوئی چیز لینے زنانے ڈرائنگ روم میں گئی تھی یہ اس رات کی دوسری بات ہے جو مجھے یاد ہے۔ زلیخا کی سیاہ ساڑھی۔ زلیخا کا محبت بھرا لہجہ بلکہ زلیخا کے سانس لینے کی آواز تک میرے طفلانہ دل پر ایک محبت کا اثر ڈال رہی تھی۔ زلیخا نے میرے پاؤں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "نسیم تم نے جوتیاں نہیں پہنیں" رات کا وقت تھا مجھے یاد نہیں کہ میں نے کچھ جواب بھی دیا یا نہیں۔ اس کے بعد میرا ہاتھ پکڑ کر زلیخا

ھوس

مجھے صحن میں سے آئی اور کسی ماما سے کچھ کہا جس نے میرے پاؤں دھو کر پونچھ دیئے مجھے اپنے چھوٹے سے پلنگ کی سفید چادر اور اس کے مقابل چاندنی اب تک یاد ہے۔

قصہ مختصر جب اس مختصر سے قیام کے بعد میں اپنے چچا کے گھر سے جانے لگا تو سب سے زیادہ جو چیز میرے دل پر حاوی تھی وہ زلیخا سے طفلانہ انس تھا۔

اس کے لہجے میں جس میں محبت کے ساتھ سرپرستی اور بزرگی کی خفیف سی جھلک شروع ہی سے مجھے نظر آتی تھی میں ایک غیر معمولی دلکشی محسوس کرتا۔ اور پھر اس کا انداز بیان! جب وہ مخاطب ہوتی تو بچپن میں بھی اس کی آواز کی شیرینی اس کے لہجے کی بے انتہا نرمی مجھ پر غیر معمولی اثر کرتی۔

اس زمانے میں وہ بہت دبلی پتلی تھی۔ اس کا جسم چھریرا تھا۔ قد چھوٹا تھا۔ لیکن اس کے کم سن کے دیکھتے ہوئے زیادہ چھوٹا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اس زمانے میں بھی اس کے دوسرے بہن بھائیوں کے مقابل صاف نہ تھا۔

بچپن میں بھی میری طبیعت میں کچھ گہرائی موجود تھی۔ میری باتوں کو سن کر اکثر لوگ مجھ سے آپ ہی آپ مانوس ہو جاتے۔ کم سے کم اپنے خاندان کی حد تک بچپن میں تو بہت چہیتا تھا۔ اس لئے جہاں تک میں سوچتا ہوں، زلیخا سے انس کی وجہ یہ نہیں معلوم ہوتی۔ کہ وہ مجھے بچپن میں بہت چاہتی تھی۔ کیونکہ اس کی دوسری بہن بھی مجھے اسی قدر چاہتی تھی۔

پہلی فضا

تو پھر کیا اُس زمانے میں بھی میں اس کی ہستی میں کوئی خاص بات محسوس کرتا تھا؟

۲

اس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی سال گزرتے گئے۔ پرانی چیزیں فنا ہوتی گئیں نئی چیزیں پختہ اور بالکل جدید چیزیں ظہور میں آئیں۔ میرے جسم کے ساتھ میرا ذہن اور دماغ بھی نشو و نما پاتا رہا۔

اس کئی سال کے عرصے میں ایک مرتبہ بھی مجھے بمبئی جانے کا اتفاق نہ ہوا اور نہ اس کی کوئی امید ہو سکتی تھی کہ کسی خاص غرض سے طویل قیام کے لئے بمبئی جانے کی ضرورت پیش آئے گی۔

اس اثنا میں نہ میں بمبئی گیا۔ اور نہ زلیخا کبھی حیدرآباد آئی۔ لیکن میرے ذہن میں زلیخا کی تصویر برابر موجود تھی۔ اس کی سیاہ ساڑی اور اس کا زردی مائل نمکین چہرہ اب تک میرے دل پر نقش تھے وہ خفیف سا قلبی لگاؤ اب اس طویل جدائی کی وجہ سے ایک خیالی رنگ اختیار کر چکا تھا۔

اور اکثر راتوں کو جب تاریک بادل حیدرآباد کو چاروں طرف گھیر لیتے۔ اور شہر کی گنجان فضا، ابرِ باراں سے تاریک تر ہو جاتی تو میں ایک شیریں قلبی کیفیت سے کسی کتاب کو چھوڑ کر سوتے وقت زلیخا کے تخیّل کو اپنے ذہن میں قائم رکھنے میں محو ہو جاتا یہاں تک کہ اس کی ساڑی کی سیاہی میرے نیند بھرے دماغ کے نزدیک بادلوں کی سیاہی

میں مل کر دور ہوتی ہوئی معلوم ہوتی۔ اور جب میں آنکھیں کھولتا۔ تو صحن کی جانب
بجلی کی چمک دیکھ کر دوسری کروٹ بدل لیتا۔ پانی کے گرنے کی آواز مجھے سلانے
میں مدد دیتی اور سوتے وقت بھی زلیخا کا تصوّر، جس نے اب ایک خیالی معیار اختیار کر
لیا تھا، خیالات کے پیہم تصادم کے باہمی وقفوں میں برابر مجھے مصروف رکھتا۔

اس طرح چھ سال گزر گئے۔ اب میری زندگی کے سولہ سال ختم ہو چکے تھے
میرا سترھواں سال شروع ہو چکا تھا۔ اور یہ سال میرے خیال میں ہر نوجوان کی زندگی
کا اہم سال ہوا کرتا ہے۔ کم از کم ذاتی حد تک تو میرا یہی تجربہ ہے۔

مجھے مصوّری سے بچپن سے بہت دلچسپی تھی۔ بھائی جان کی کتابوں میں سے
اکثر تصویریں غائب ہو جایا کرتی تھیں کئی مرتبہ ان کا خیال میری طرف منعطف ہوا۔
لیکن میں نے ہر مرتبہ پوری طرح والد صاحب کو یقین دلایا کہ یہ سراسر ان کی زیادتی ہے
اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا۔ کہ جب بھائی جان مجھے ڈانٹ چکتے تو ابّا جان کا لکچر شروع ہوتا
کہ اتنے بڑے ہو گئے شرم نہیں آتی۔ خواہ مخواہ چھوٹے بھائی کو ستاتے ہو۔"

قصّہ مختصر، عمر کی رفتار اور ذہنی سنجیدگی کے ساتھ تصویروں کا بھی صحیح مذاق پیدا ہونے
لگا۔ اسکول کے زمانے میں میں نے ڈرائنگ کے تمام ضروری امتحانات پاس کر لئے
اور انٹرمیڈیٹ کے زمانے میں اس شوق نے اس قدر ترقی کر لی کہ کالج سے زیادہ تصویروں
میں وقت صرف کرنے لگا میں نے استادانِ فن کے شاہکاروں کی نقل سے ابتدا
کی اور اس سلسلے میں میری سب سے زیادہ کامیاب نقل تی تیانو کے شاہکار "پاک اور ناپاک

پہلی فضا

محبت کی نقل تھی جس کے بعد میں نے چند قدیم یونانی شاہکاروں اور نشاۃ ثانیہ کے شاہکاروں میں سے لیونارڈو ڈاونچی کے "مونالیسا" تی تیانو کی "فلورا" اور سانڈرو لحتے چلی کی بہار وغیرہ کو نقل کیا۔ ان سب کی مصوری کی نقل بھی کوئی معمولی بات نہ تھی۔ "مونالیسا" کی نقل کو کپڑے پر نمایاں کرتے وقت صرف اس کے سیدھے ہاتھ کو لیونارڈو ڈاونچی کا بنایا ہوا ہاتھ بنا کر پیش کرنے میں میرے کئی ہفتے گزر گئے۔

جب یہ شوق جنون کی حد تک بڑھ گیا۔ تو میرے والد نے مجبوراً یہ سمجھ لیا کہ ہندوستان جیسی خشک فضا میں بھی اگر کسی کو مصوری کا قدرتی ذوق ہو تو اس کے ذوق کو پورا ہی کرنا چاہئے۔ انہوں نے میری مصوری کے کارنامے اپنے کئی دوستوں کو دکھائے اور ان کے مشورے سے مجھے بمبئی بھجوا دیا تاکہ میں بمبئی کے آرٹ اسکول میں دل کھول کر خود کو فن کے لئے وقف کر دوں۔

بہر کیف میں بمبئی پہنچا۔ تو چچا نے میری رہائش کا خاص انتظام کیا۔ میرے اسٹوڈیو کے لئے وہ کمرہ دیا جس کی کھڑکیاں سمندر کی جانب کھلتی تھیں تاکہ فضا اور وہ منظر میرے فن کو قدرتی طور پر بھی مدد دے سکے۔ اسٹوڈیو کے قریب ہی میری چھوٹی سی خواب گاہ تھی جس میں چند خوبصورت شلف بھی تھے تاکہ میں اپنی خاص اور محبوب کتابیں ان میں رکھ سکوں۔

ایک شام کو میں بیٹھا ہوا تھا۔ کہ چچا جان کی آواز آئی "تمہاری چچی آ گئی ہیں۔" معاف کیجئے گا۔ میں یہ کہنا بھول گیا تھا۔ کہ جس زمانے میں میں بمبئی پہنچا ہوں چچی صاحبہ

اوران کے ساتھ میری چچازاد بہنیں مہابلیشور گئی ہوئی تھیں۔ میں اپنے کمرے سے نیچے اترا اور زینے پر مجھے چچی صاحبہ ملیں، ان کے پیچھے ایک ساتھ امینہ اور سلیمہ تھیں اور چند زینے پیچھے ——— زلیخا۔

ان سب سے زیادہ مجھے اتنے دنوں کے بعد زلیخا کو دیکھ کر مسرت ہوئی زلیخا کا جسم اب نسبتاً بھاری ہو گیا تھا لیکن نہ اس قدر زیادہ کہ بہت بدنما معلوم ہو۔ لیکن وہ میری خیالی زلیخا سے بے انتہا مختلف تھی۔

ان سب نے مجھے دیکھ کر بہت زیادہ خوشی کا اظہار کیا۔ اور اس کے بعد سب اوپر چلی گئیں سفر کی تکان اتارنے اور میں چچا جان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گیا۔ چچا جان کسی دوسرے تاجر سے باتیں کر رہے تھے۔ چائے آئی اور چائے پینے میں میری توجہ ملازم کے قدموں کے ساتھ زینوں کے اوپر چلی گئی۔ اور پھر ایک مرتبہ میں نے خیالی زلیخا کو گوشت و پوست کی زلیخا میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا۔

مجھ سے نہ رہا گیا میں جوں توں کر کے جلدی سے چائے ختم کر کے اوپر چلا گیا۔

۳

"آؤ نسیم، اتنے دنوں میں تمہاری صورت تو بالکل بدل گئی" چچی نے صندوق کھولتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ اور اس کے بعد بولیں "تم کو آئے پندرہ دن ہو

گئے ہوں گے۔ یہاں اکیلے میں جی تو نہیں گھبراتا تھا؟"

زلیخا نے کہا: "اور کیا جی تو ضرور گھبراتا ہوگا۔ یہاں بالکل نئے نئے آئے ہو۔ اور پھر گھر بھر میں سوائے ابّا جان کے کوئی نہ تھا"

امینہ نے کہا: "اچھا نسیم اتنے دنوں میں تم ہم لوگوں کو بھول تو نہیں گئے؟"

اور سلیمہ اس اثنا میں برابر مسکراتی رہی۔

ان تمام گرمجوش سوالات کا جواب دینے کو میں نے گھبرائی ہوئی ہنسی ہنس کر کہا۔ جی نہیں بھولتا کیسے!"

چچا جان کو بمبئی میں سکونت اختیار کئے دس سال کے قریب ہو چکے تھے مگر گھر بھر کا طور طریق اب بھی حیدر آبادی تھا۔ زنانے کپڑے بالکل حیدر آبادی تھے۔ ساڑیوں نے میمن وضع اختیار نہ کی تھی۔ اور لب و لہجہ بھی بالکل حیدرآبادی تھا جس میں قدیم دہلوی لہجے کی ذرا سی خاندانی جھلک نمایاں تھی۔

زلیخا نے پھر مجھ سے پوچھا: "تم چائے پی چکے؟"

میں نے کہا: "جی ہاں"، جس پر اس نے ہنس کر کہا: "تم سے اتنا صبر کہاں ہوتا کہ ہمارے ساتھ پیتے۔ اچھا اب آؤ پھر ہمارے ساتھ چائے پی لو۔"

میں نے ہنس کر کہا: "جی نہیں میں پی چکا"

زلیخا نے کہا "ارے . . . . . اگر اور پی لو گے تو کیا ہو جائے گا" اس محبوب کرنے والے جملے کا مزہ میں گھنٹوں تک دل ہی دل میں لیتا رہا۔

میں نے دل میں بہت خوش ہو کر کہا "بہت اچھا" لیکن میرے چہرے کی زردی مجھے محسوس ہو رہی تھی۔

اس کے بعد آئینہ نے کہا "اچھا اب ہم لوگ جاتے ہیں"

اور وہ تینوں چلی گئیں۔ میں وہیں ایک کرسی پر کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ میری نظروں کے سامنے سمندر تھا۔ اور اس میں چلتی ہوئی یا کناروں پر کھڑی ہوئی دور دراز کشتیاں، میرے کان شہر کے شور کی مدھم آواز کو سن رہے تھے۔ اس ماحول میں میرا قلب ایک جمود محسوس کر رہا تھا! اور اس جمود میں مجھے زلیخا کی شکل نظر آ رہی تھی۔

زلیخا کا جو تخیل میرے قلب میں اس طویل غیر حاضری میں پیدا ہو گیا تھا۔ وہ مٹ چکا تھا صرف شکل کا تخیل۔ زلیخا کی ہستی کو میں اب پہلے سے زیادہ نزدیک محسوس کر رہا تھا۔ گوشت و پوست کی یہ زندہ چلتی پھرتی زلیخا پہلے سے زیادہ حقیقی زلیخا معلوم ہو رہی تھی اس کی بات چیت میں اس کے اندازِ بیان میں میں پہلے سے زیادہ یگانگت پا رہا تھا۔

میرا سلسلۂ خیال ابھی زلیخا کے تخیل اور سمندر کی لہروں کے باہمی تصادم میں منہمک ہی تھا۔ کہ ایک ماما نے کہا "چلئے آپ کو زلیخا بیگم بلا رہی ہیں"

میں زلیخا کے پڑھنے کے کمرے میں پہنچا۔ تو وہ ایک کوچ پر لیٹی ہوئی کچھ پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے کہا "آؤ نسیم میں نے تمہیں اپنی ڈرائینگ کی کاپی دکھانے کو بلایا تھا تاکہ مجھے ڈرائنگ میں کچھ مدد دو"

یہ کہہ کر وہ اپنی میز کی طرف گئی میز کمرے کے کونے میں رکھی تھی اور میز کے پاس ایک

کرسی تھی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ میز کے قریب تک گیا۔ اس نے کہا "بیٹھ جاؤ"
میں کرسی پہ بیٹھ گیا۔ اور اس نے میز کے خانے سے ایک کاپی نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔
اور اس کے بعد میرے قریب جھک کر وہ مجھے ذہنی ڈرائینگ کی مشقیں دکھاتی
رہی لیکن اس سے ـــــ اس کے جسم سے ـــــ اس قدر زیادہ قربت کی وجہ سے
میں ایک بے اطمینانی کی سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔

میری توجہ کا بہ مشکل دسواں حصہ اس ڈرائینگ کی کاپی میں صرف ہو رہا ہوگا۔ اس
نے میری طرف دیکھ کر نرم اور خوشگوار لہجے میں کچھ پوچھا۔ میں اس کے سوال کو اچھی طرح
نہ سمجھ سکا۔ میرے چہرے کا رنگ طفلانہ حجاب کی وجہ سے بدل گیا۔ اور زلیخا نے اس
تبدیلئ رنگ کو محسوس کیا۔ اور وہی حجاب کا رنگ اور پُر حجاب تبسم اس کے چہرے پر بھی
نمودار ہوگیا۔

مگر اس کمزور شرمیلے پن کو دفع کرنے کی دو طرفہ کوشش کے ساتھ اس نے کچھ اور
پوچھے اور میں نے جواب دینے کی کوشش کی۔

اس کے بعد وہ باتیں کرتے کرتے ذرا دور ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ میں اس بے اطمینانی
سے نجات پا کر کسی قدر قلبی تاسف محسوس کرنے لگا لیکن پھر برف کی سی سردی جو
جذباتی طبیعتوں کا خاصہ ہوتی ہے، میرے ذہن کے بالائی حصے پر حاوی ہوتی گئی۔ اور
میں نے پوری کوشش کے ساتھ ڈرائنگ کے متعلق چند باتیں اسے سمجھائیں۔

یہ پہلی مرتبہ تھی کہ میں اپنے آپ کو کسی نسوانی ہستی سے اس قدر قریب محسوس کر

رہا تھا چچازاد بہنیں اگرچہ کہ برائے نام سہی پھر بھی بہنیں کہلاتی ہیں لیکن ان کی صنفیت ان کی نسوانیت کا اثر ہونا بھی لازمی ہے۔

اور جب میں واپس اپنے کمرے میں پہنچا تو تاریک سمندر کے درمیان اِدھر اُدھر رقص کرتی ہوئی جنبش کی جھلک دیکھتے دیکھتے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اکثر اسی حالت میں آنکھیں بند کر کے میں حقیقت میں تصویر ہر "سائکی" کو غسل کرتا دیکھتا لیکن آج بجائے سائکی کے تاریک جنبش کرتی ہوئی لہروں کے ساتھ میری بند آنکھوں کو زلیخا کی تصویر نظر آئی۔

میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ کیا زلیخا سے محبت خالص برادرانہ محبت نہ تھی؟ کیا اس میں جنسی جذبات کی خفیف ترین جھلک بھی تھی؟

میرا الوجوان ناتجربہ کار دل دھڑکنے لگا۔ لیکن میرے ضمیر نے جو ابھی تک بیشتر لوث تھا جس میں طفلانہ معصومیت اب تک باقی تھی مجھے ملامت کی۔

اور پھر میں "سائکی" کی نامکمل تصویر کو بے خیالی کے انداز سے دیکھنے میں محو ہو گیا۔

ضمیر کی آواز میری اس خفیف سی دلی کمزوری پر ہر تبدیلیٔ خیال کے بعد ملامت کرتی سنائی دیتی۔

۴

"سبحان اللہ! شہزادہ صاحب ابھی تک آرام فرما رہے ہیں"

پھسلی فضا

نیند کی رخصت کے ساتھ یہ الفاظ میں نے بہت صفائی سے سنے! اور اس کے ساتھ ہی ایک ہنسی کی آواز نے میرے بلانکٹ کو اٹھا کر پھینک دیا۔ اور میں ابھی اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ جمیل مجھ سے لپٹ گیا۔

جمیل میرا چچا زاد بھائی تھا۔ مہابلیشور سے آتے آتے رات کو وہ دادر پر کسی کام سے رک گیا تھا اور صبح وہ پہنچا تو میں سو رہا تھا۔ میں نے ایک عرصے کے بعد اس کو دیکھا مگر مجھے یقین تھا کہ اس شکل وشباہت کا نوجوان جو بے دھڑک آ کر مجھے ستانے لگے سوائے جمیل کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ جمیل مجھ سے سال بھر چھوٹا تھا۔ لیکن دیکھنے میں میرے برابر معلوم ہوتا تھا۔

اچھا اور بتاؤ بھائی نسیم تم تو صورتی کر رہے ہو۔ مزے میں ہو۔ کہو اتنے دن کیسے گزرے، کیسے رہے؟"

میں نے کہا "اچھی طرح گزرے۔ مگر تم بھی عجب بے مروت نکلے کہ مہابلیشور سے ایک خط بھی نہ لکھا۔"

کھڑکی سے دھوپ تیزی کے ساتھ داخل ہو رہی تھی جس کی وجہ سے میرے سر میں درد سا ہو رہا تھا۔ دیوار کے قریب کمرے کے سب سے زیادہ ٹھنڈے کونے میں ایک آرام کرسی بچھی ہوئی تھی۔ میں اس پر جا کر بیٹھ گیا۔ جمیل میرے قریب ایک اور کرسی گھسیٹ کر پیر پھیلا کر بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا "بھائی نسیم، تم دبلے بہت ہو گئے۔ کل سے ٹینس شروع کر دو۔"

میں نے کہا "اچھا۔ مگر یہ تو بتاؤ۔ کہ تم کل رات کو رُک کیوں گئے تھے"
اس نے اس غیر متوقع سوال پر جھنجلا کر کہا " زلیخا کے مارے ناک میں دم ہے بہر حال اسی نے کچھ سامان منگوایا تھا۔ مجھے رک جانا پڑا۔"
میں نے کہا " تو تم یہاں آ کے بھی منگوا سکتے تھے۔ خود جانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ کسی کو بھیج دیتے"
اس نے پھر اسی غصّے کے لہجے میں کہا " اور پھر وہ گھنٹوں بیٹھ کر اباّ جان سے میرا دکھڑا روتی۔ بڑے میاں کی عقل کو خدا جانے کیا ہو گیا ہے۔ جو بی زلیخا نے کہہ دیا۔ وہ ان کے ذہن میں سما گیا"
میں بمبئی آنے سے پہلے زلیخا کی تندیٔ مزاج کی بہت سی شکائتیں سن چکا تھا اور ان میں سے ایک کی طرف بھی میں نے کبھی دھیان نہ دیا تھا۔ اکثر تو شکایت کرنے والوں کو میں نے کچھ مخالفانہ جملے کہہ کر ٹال دیا تھا۔ لیکن زلیخا کے سگے بھائی کی زبانی یہ الفاظ سن کر میں فوراً ٹھٹک گیا۔
"کیوں! قصہ کیا ہے؟" میں نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"قصہ کیا ہوتا" جمیل نے اسی جوش اور غصّے کے لہجے میں کہا۔ "اس نے ابا جان اور اماں جان دونوں کی طبیعتوں میں اتنا دخل پیدا کر لیا ہے۔ کہ وہ دونوں اس کے کہنے پر چلتے ہیں۔ گھر میں اسی کا راج ہے"
اس پر میں نے جمیل سے چھیڑنے کے لئے کہا " تو اس میں برائی کونسی ہے؟"

پہلی فضا

جمیل نے ایک خشک ہنسی سے میرے مذاق کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہوتے اپنے لہجے کو کرا کر کہا "نسیم تم میری جگہ ہوتے تو معلوم ہوتا۔"

چند لمحوں تک جمیل کو اپنے خیالات میں مصروف رہنے کا موقعہ دے کر میں نے اس کی طرف جھک کر پوچھا "کچھ بتاؤ تو سہی کیا کل کوئی خاص بات پیش آئی؟"

اور اس نے کہا "نہیں۔"

میں نے کہا "پھر؟"

وہ دق ہو کر کہنے لگا "بھئی یہ تو روز کا قصّہ ہے۔ ایک مجھی پر کیا موقوف۔ امینہ آپا اور سلیمہ آپا دونوں اس سے ناراض ہیں۔"

"آخر کیوں؟"

"بھئی وہ آپا جان سے ہر وقت چغلیاں کھایا کرتی ہے۔ اور اس کے علاوہ گھر بھر کی ہر ماما یہاں تک کہ وہ شخص جس کو اس گھر سے خفیف سا بھی تعلق ہے زلیخا کے ہاتھوں نالاں ہے۔" اور اس کے بعد اپنی کرسی کی پشت کا سہارا لگا کر پیچھے کی طرف جھکتے ہوئے اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا "اور اب تمہاری بھی باری آ گئی۔"

میں نے اب کسی قدر سنجیدہ دلچسپی کے ساتھ کہا "کیوں میں نے کیا بگاڑا ہے؟"

اس نے پھر نوجوان کھلاڑی کے سے بے فکر انداز سے لیکن کسی قدر توجہ کے ساتھ جواب دیا "بگاڑنے یا بنانے کا سوال نہیں۔ یہ تو طبیعت کا خاصہ ہے بچھو جب چلتا ہے تو ہر ایک کو ڈنک مارنے کی کوشش کرتا ہوا چلتا ہے۔"

ھــوس

اور اس کے بعد جمیل بحث سے گریز کرنے کے انداز سے اپنی جیب سے رومال نکال کر اپنی انگلیوں سے اسے مروڑنے لگا لیکن پھر میرے سوال نے اس کی توجہ کو جذب کر لیا۔
"جمیل تم کو اپنی بہن کے متعلق اس قسم کے جملے استعمال نہیں کرنے چاہئیں" میرے لہجے کی نرمی کو اُس کے جواب کی فوری تیزی نے فوراً کاٹ دیا۔
"اے بڑھوبھی میں سچ کہتا ہوں کہ اگر مجھے دنیا میں نفرت ہے تو صرف نسیمہ سے" میں کچھ دیر خاموش رہا۔ اور آرام کرسی پر لیٹے لیٹے جمیل کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ پیری طرف برابر غور سے دیکھ رہا تھا۔ اور مجھ سے آنکھیں چار ہوتے ہی اس نے کہا "نسیم تم ابھی نئے نئے آئے ہو۔ اس لئے تم کو یہ باتیں انوکھی معلوم ہو رہی ہیں یہاں رہتے رہتے تم اس کے عادی ہو جاؤ گے"
وہ پھر خاموش ہو گیا۔ انگلیوں کے مشغلے کے درمیان رومال اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ وہ اس کو اٹھانے کے لئے جھکا۔
دفعتہً نیچے سے چچاجان کی خفگی کی آواز آئی۔ جمیل اسی جھکی ہوئی حالت میں نہایت توجہ اور سفید چہرے کے ساتھ سننے لگا۔ اور پھر سیدھا ہو کر مجھ سے کہنے لگا۔ "دیکھا۔ صاحبزادی نے آتے ہی پھر کسی کی طرف سے جڑ دی"
سامنے سے نسیم اللہ گزری۔ دروازے سے اس کی جھلک دیکھ کر جمیل نے آواز دی۔ "نسیم اللہ بی۔ ادھر آؤ"

پہلی فضا

بسم اللہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کے کچھ قطرے جھلک رہے تھے۔ اس نے روتی آواز میں کہا: "میاں میں جاتی ہوں۔ پہلے زلیخا بیگم کا کام کر دوں نہیں تو اب کی مرتبہ وہ مجھے نکلوا دیں گی۔"

میں اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ چچا جان اس کو دہلی سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ حیدر آباد میں چھ سال تک وہ برابر ملازم رہی۔ اس کے بعد بمبئی میں پورے دس سال اس نے ملازمت کی۔ زلیخا کو اس نے گودوں میں کھلایا تھا۔

جمیل نے کہا: "اچھا جاؤ۔"

اور اس کے بعد جمیل نے میری طرف دیکھا۔ گویا یہ اس کے بیان کا فوری ثبوت تھا۔ دل میں میں قائل ہو چکا تھا لیکن میں نے اپنی شکست کا اس قدر جلد اعتراف نہیں کیا۔

"مگر میرے ساتھ وہ بہت محبت واخلاص سے پیش آتی ہیں۔"

"محبت واخلاص!" جمیل کی حقارت آمیز نظروں نے میرے الفاظ کو دہرایا اور اس کے بعد اس کی ہنسی نے زبانِ حال سے جواب دیا: "مصنوعی اخلاقی اور ظاہرداری کہو۔"

میں خاموش ہو گیا۔ زلیخا کے سوا اگر میں کسی اور چیز پر بھی غور کر رہا تھا تو وہ آرام کرسی کے بازوؤں کی لکڑی تھی۔ لکڑی پر ہاتھ رکھ کر میں اور زیادہ آرام سے دراز ہو گیا۔

جمیل نے کہا "میں کپڑے بدل کر ابھی آتا ہوں" اس کے لہجے کی ساری تیزی اور
ناگواری ختم ہو چکی تھی۔ جاتے وقت اس کا شگفتہ چہرہ، اس کا شگفتہ تبسّم اسے بے
فکر، با محبّت اور ٹینس کا پکا کھلاڑی "جمیل" ظاہر کر رہا تھا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے دیدہ و شنیدہ واقعات پر اپنے دل میں تبصرہ
شروع کیا۔ میری توجہ زلیخا کے ذہن کی سختی کو یاد کر کے اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ ایک حد
تک یقینی طور پر دل کی سختی کی نشانی ہے اس کے لبوں میں ایک قسم کا عزم، نسوانی عزم
پایا جاتا تھا۔ اس کا چہرہ حسن سے قطعاً معرّا تھا ـــــ میں پھر دہراتا ہوں قطعاً معرّا ـــ
لیکن اس کے باوجود اس کے خد و خال میں ایک نمکینی تھی جس کا اثر جنسیّت لئے
ہوئے تھا۔ اس کا بالائی لب کسی قدر دھنسا ہوا تھا جس سے اس کے بشرے پر
ایک خفیف سا نیم مردانہ پن جھلکتا تھا۔ اس کی آنکھیں نسوانی شعاعوں سے بالکل
معرّا تھیں بعض اوقات جب وہ کسی سوچ میں محو ہو جاتی، تب اس کے بشرے سے اس
کی عمیق اور با عزم طبیعت کا کچھ اندازہ ہو سکتا۔ اس حد تک میرے حافظے نے مجھے
زلیخا کی نسبت کوئی رائے قائم کرنے میں مدد دی۔

اس کے بعد پھر واقعات تھے۔ اس کی گرمیٔ مزاج ـــــ یا اگر میں زیادہ واضح
الفاظ میں کہوں تو بد مزاجی ـــــ کے قصّے سننے کے بعد میں اپنی آنکھوں سے
دو مثالیں دیکھ چکا تھا۔

"تو پھر اس کے والدین اس قدر اس کے اثر میں کیوں تھے؟ اس کا جواب میرے

پہلی فضا

ذہن نے بہت جلد سے دیا بعض گہری طبیعت والے بچے اپنے والدین پر پہلے ہی طبیعت اور پھر مزاج شناسی کی وجہ سے بہت حاوی ہو جاتے ہیں۔ اور پڑا زمانہ انس سے قطع نظر دنیاوی معاملات میں بھی ان بچوں کے مشورے ان کو بہت مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ اولاد کو ان کی طبیعت میں بہت دخل ہو جاتا ہے۔

کیا یہی معاملہ یہاں بھی تھا؟

جواب بہت صاف تھا جمیل کو زبیدہ کالج کی طالبات اور اس کے بیڈمنٹن سے اتنی فرصت کہاں ملتی۔ کہ وہ اپنے والدین کی طبیعت میں رسوخ پیدا کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کے علاوہ امینہ اور سلیمہ کی طرح اس نے بھی بے فکر اور لا ابالی طبیعت پائی تھی ممکن تھا کہ اس کے والدین اس کو زلیخا سے زیادہ چاہتے ہوں لیکن محبت اور چیز ہے اور اثر دوسری چیز۔

پھر اپنے اس رسوخ کا بے جا استعمال کوئی عجیب بات نہ تھی۔ زلیخا کی طبیعت اس قدر بری نہ تھی جس قدر کہ جمیل سمجھتا تھا۔ لیکن طبیعت کی تیزی سے مستحق انکار نہ کر سکتی تھی۔

میں نے اپنے آپ کو نسبتاً خوش قسمت تصور کیا۔ کہ زلیخا کی نظر عنایت سب سے زیادہ میرے حال پر تھی۔ اس کا اخلاق مصنوعی اخلاق ہی سہی۔ مگر نسوانی طبیعتوں کی کمزوری کے خاصے سے مصنوعی اخلاق اور حقیقی اخلاق اکثر آپس میں بدلتا رہتا ہے۔ اس کے بعد خدا جانے کن کن خیالات کی باہمی آمیزش سے میں مسکرایا۔

ـسوس

دھوپ تیز ہو رہی تھی۔ دیر سے سو کر اٹھنے سے جو سستی محسوس ہو رہی تھی وہ اس دلچسپ گفتگو، جمیل سے ملاقات اور اس دلچسپ سلسلۂ خیالات میں دب گئی تھی لیکن دھوپ کی تیزی کے ساتھ میں نے اپنے سر میں درد کی ایک خفیف سی چمک محسوس کی، اور میں غسل خانے میں چلا گیا۔

۵

ہم سنی کے باعث وہ راز داری کی باتیں جو دونوں میں ہونا لازمی ہیں مجھ اور جمیل میں برابر ہوتی رہیں۔ جمیل نے گھر کی پوری سیاست مجھ سے بیان کر دی گھر میں دو پارٹیاں تھیں۔ ایک پارٹی میں زلیخا تھی اور اس کے والدین اس کے سرپرست تھے دوسری پارٹی میں جمیل کے ساتھ امینہ اور سلیمہ تھیں۔ وہ دونوں زلیخا سے نالاں تھیں۔

زلیخا کے کردار کا مطالعہ کر کے اور اپنے خیالی مفروضات سے کچھ دیر تک قطع نظر کر کے میں جس نتیجے پر پہنچا وہ یہ تھا۔ کہ زلیخا کی طبیعت کا ناگوار پہلو صرف دو چیزوں سے مرکب تھا۔ خود پسندی اور نخوت۔ ان کے سوا اس کی طبیعت میں کوئی ناگوار بات نہ تھی۔

نسوانیت نے خود پسندی اور نخوت کو اور زیادہ ناگوار اور تکلیف دہ بنا دیا تھا۔ نسوانی طبیعت کے بے موقعہ جزرومد اسے اپنے اختیارات غلط طور پر استعمال کرنے میں مدد دیتے رہے۔

پہلی فصل

اس خود پسندی اور نخوت کا میں نے اپنے دل میں تجزیہ کیا تو اس کے بعض عناصر بہت اچھے معلوم ہوئے۔ اس خود پسندی اور نخوت کو صرف ایک موقعہ شناس بلند خیال اور آزاد روح ہی اس طرح استعمال کر سکتی تھی۔ اس میں نخوت بھی تو اپنے ہم عمروں کے ساتھ انسانی خاصے کے مطابق وہ اپنے بڑوں کو نیچا دکھانی بلود میں نے تھوڑی دیر کے لئے یہ سمجھ لیا۔ کہ نیچا دکھانا ہی اس سے رشک و حسد کا باعث تھا عام نسوانی طبیعتوں کی طرح اس میں رشک تھا اور ضرور تھا۔

جمال پرستی اور فن کاری سے جو نرمی بلکہ کمزوری میری قدرتی کمزور فطرت میں پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود میرا ذہن اور میری روح قطعاً آزادی پسند تھی یہی زلیخا میں اس آزادی پسند روح کا نسوانی عکس دیکھ کر اس میں اپنی طبیعت کا جواب پاتا۔

گھر بھر میں سب سے بہت لاابالی اور بے فکر طبیعتیں پائی تھیں جمیل کو نہ کسی قسم کی سنجیدہ ذمہ داریوں کا احساس تھا۔ اور نہ ذمہ داریوں کی برداشت کی حقیقت۔ امینہ کے تین گھنٹے نگار خانے میں صرف ہوتے اور باقی وقت سرشار اور شرر کے مطالعے میں سلیمہ کو جب بیلیں بنانے سے فراغت ہوتی۔ تو وہ گھنٹوں اپنی سہیلیوں سے معصوم لہجے، معصوم تبسم، اور معصوم جنبشوں کے ساتھ ہنس ہنس کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہتی۔

ان سب سے زیادہ گہرے خیالات اور احساس کی ذہنی صلاحیت زلیخا

نے پائی تھی۔ یہی وجہ تھی۔ کہ میں اس کے انہماک میں اکثر اپنی ذہنی مصروفیتوں، اپنی فن کاری کا جواب پاتا۔ اور مجھے اس کے اس انہماک میں اس کی طبیعت کی تمامتر خامیاں فراموش ہو جاتیں۔

اس کی تمامتر خامیاں اس کی خود پسندی اس کی نخوت دوسروں کے لئے تھی۔ اس نے کبھی کم سے کم میرے سامنے اس وقت تک ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا تھا۔ جو مجھے ناگوار گزرتا۔

یہ سب کچھ تھا۔ ظاہرا کسی چیز میں خفیف سا بھی فرق نہ آنے پایا تھا تاہم اب میں اپنے احساسات میں ایک ہلکی سی تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔

جمیل سے مبہم گفتگو کے بعد میری اثر پذیر طبیعت "حلقۂ دامِ خیال" میں غیر محسوس طور پر غیر ارادی طور پر اسیر ہو چکی تھی۔ اب میں اسے وہ خیالی مجسمۂ خلوص و انس زلیخا نہیں سمجھتا تھا۔ اب وہ ایک جمال پرست حسن کار کا ایک نمونۂ کمال خلوص نہ تھی وہ میری نظروں میں اب صرف ایک عورت تھی،.... ایک عورت۔ عام سطح سے کسی قدر بلند مگر پھر بھی عورت۔

یہ دوسرا مادی احساس تھا جو زلیخا کی نسبت مجھے ہوا۔ پہلی مرتبہ جب میں نے گوشت و پوست کی زلیخا کو دیکھا۔ تو ذرا سی خلافِ توقع تبدیلی کی تلافی، اس کی زندگی کی گرمی نے کر دی۔ لیکن اب بلا کسی خاص وجہ کے وہ اس بلند معیار سے گر کے میری نظروں میں صرف ایک عورت رہ گئی تھی۔

لیکن ایسی عورت جس میں صرف نسوانیت نہ تھی بلکہ نسوانیت کے ساتھ کچھ دماغ بھی تھا کتنا ہی الجھا ہوا بالکل نسوانی دماغ ہی کیوں نہ ہو۔ مگر پھر بھی وہ ایک دماغ رکھتی تھی۔ اور عورتوں خصوصاً ہندوستانی عورتوں میں یہ بھی بہت غنیمت ہے۔

اس کی کشش میرے دل میں باقی رہی۔ صرف رنگ بدل گیا۔ گویا اب مجھے کسی خطرناک چیز سے انس تھا۔ اور اس انس میں بھی اب رفتہ رفتہ خطرے کی ایک خفیف سی جھلک پیدا ہوتی گئی۔

یہ میرا دوسرا نفسی انقلاب تھا۔ زلیخا اب مجھے زلیخا نہیں کلیوپیٹرا نظر آتی تھی۔ بے عمل اور جمال پرست طبیعت کبھی اپنے خیالی مفروضات پر غالب نہیں آسکتی کچھ دنوں کے بعد میں سارجنٹ کا شاہکار "ایلن ٹیری" لیڈی میک بیتھ کے لباس میں، دیکھ رہا تھا پھر تخیل نے میری آنکھوں پر جادو سا شروع کیا اور لیڈی میک بیتھ کی انجھی مانا شکل کو ایک لمحے کے لئے میں نے بجائے ایلن ٹیری کے زلیخا سے مشابہ دیکھا۔

میرے دماغ نے ناگوار ناکامی کے پست کر دینے والے اعتراف کے ساتھ یہ طے کر دیا۔ کہ زلیخا اب اوفیلیا نہیں رہی لیڈی میک بیتھ کے کردار کا زہر اس کی طبیعت میں اس کے خون کی گردش میں سرایت کئے ہوئے ہے۔

اس وقت تک میرے پاس اس خیال کی کوئی عقلی دلیل نہ تھی صرف یہ کہ یہ خیال مجھے شاعرانہ معلوم ہوتا تھا۔ ....

میں کپڑے بدل کر جمیل کے ساتھ ٹینس کھیلنے چلا گیا۔

۶

دن گزرتے گئے۔ اپنی فنی مصروفیت کے بعد میری توجہ جب زلیخا کی طرف منعطف ہوتی۔ تو معلوم ہوتا۔ اس کی وہ حرارت ختم ہو چکی ہے۔ پھر بھی میں زلیخا کے خیال میں ایک سرور محسوس کرتا۔

اب وہ میرے لئے صرف ایک گزرتا ہوا خیال نہ تھی۔ گزرتے ہوئے دنوں کے ساتھ اس کے بات کرنے کے طریقے اس کے ہاتھوں کی جنبش اس کے چلنے کا انداز ان سب کا ایک دھندلا عکس، متحرک تصویر کیطرح میرے دماغ میں باقی رہنے لگا۔ اجنبیت جو اتنے عرصے تک الگ رہنے سے قدرتی طور پر پیدا ہو گئی تھی۔ اب فنا ہو چکی تھی۔ وہ اب کوئی غیر معمولی چیز نہ تھی۔ وہ بھی گوشت و خون کا ایک جاندار مجسمہ تھی۔ لیکن اب میں اس میں زندگی کی آگ محسوس کرنے لگا تھا۔

دوسروں سے باتیں کرتے کرتے یا یوں ہی جب وہ اپنے مخصوص انداز سے سر کو پیچھے کی طرف ہٹا کر اپنے شیریں لہجے میں مجھ سے دریافت کرتی یا کوئی بات کرتی تو اس کے لہجے کی یگانگت اس کی زبان کی شیرینی کارفرمائی میرے دل میں بہت دور تک سرایت کر جاتی۔

ایک صبح کو میں اور جمیل دونوں اندر چائے پی رہے تھے زلیخا نے کہا نسیم

ڈرائنگ میں آج دوپہر کو تم مجھے ذرا مدد دے دینا۔ تھوڑے ہی دنوں میں امتحان ہے۔"
دوسری باتوں کے درمیان اس کے دلفریب لہجے میں یہ جملہ مجھے ایک سیال چشمہ معلوم ہو رہا تھا جو سخت پتھروں کے درمیان پھوٹ کر بہ نکلے۔

جمیل کی پیشانی پر تنفر کی شکنیں تھیں۔ اس نے زلیخا سے بے لحاظ لہجے میں کہا "آپ سے ڈرائنگ کے امتحان میں شریک ہونے کو کس نے کہا۔"

زلیخا نے نہایت جھلائی ہوئی آواز میں کہا "تم کون ہو پوچھنے والے" اور پھر روتی آواز میں اس نے اپنی ماں سے کہا "دیکھو امّاں جان یہ جمیل ہمیشہ میرے پیچھے پڑا رہتا ہے۔"
میں نے زلیخا کے لہجے کی اس فوری تبدیلی کو ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی محسوس کیا۔ تو لہجے کی شیرینی صرف ایک مصنوعی نسوانی ادائے اخلاق تھی۔

جمیل کی آنکھوں کے شعلوں نے پھر مجھے اپنے اس خیال سے ہٹا کر اس کی طرف متوجہ کر دیا۔ میں نے جمیل کا ہاتھ پکڑ کر زور سے دبایا۔ اور وہ اسی غصّے کے عالم میں اٹھ کر باہر چلا گیا۔

لمحے بھر کے لئے خاموشی ہو گئی۔ زلیخا کے چہرے پر سنجیدہ دلکشی اور با اخلاق تبسم کی جگہ کھنچاؤ اور چہرے کی سیاہی کی جھلک نے بدل لی۔ اس کے بشرے کے ذریعے سے اس کے کردار کی نخوت و خود پسندی کے مطالعہ کا اس سے بہتر کوئی اور موقعہ نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے لیڈی میک بیتھ کا چہرہ یاد آ گیا۔ اور اس بدبخت دل کی سیاہی کی وہ خفیف سی جھلک بھی۔

پرچی نے کہا "اس چھوکرے کا دماغ بالکل خراب ہوگیا ہے"
زلیخا نے کچھ اور کہا لیکن اس طرح کہ گویا وہ اس کی کھلم کھلا مخالفت نہیں کر رہی ہے۔ بلکہ اس انداز سے جیسے کوئی اپنی رائے کا ٹھنڈے دل سے اظہار کرتا ہے۔

میں نے خیال کیا کہ شاید انہی سادہ چالوں سے اس نے اپنے ماں باپ کے دل میں گھر کر لیا ہے۔

میں گیارہ بجے تک اپنے اسٹڈیو میں لیڈی میک بیتھ کی تصویر کی نقل کی کوشش کرتا رہا۔ آج ہمیشہ سے زیادہ زلیخا کا تصور میری نظروں میں تھا۔ لیڈی میک بیتھ کے چہرے کے تمام تر زہریلے جذبات اور اس کا لباس جس میں ہزاروں افعی پھنکاریں مارتے تھے، یہ سب چھند لے ہو کر میری نظروں سے مٹتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے اور میں ایک مصور کی نظروں سے ان کی جگہ زلیخا کی صورت، زلیخا کے بھینچے ہوئے ہونٹ زلیخا کا اٹھا ہوا آیچے کا جبڑا زلیخا کی تنگ پیشانی اور زلیخا کے سیاہ موٹے چمکدار بالوں کو تشکیل پاتا دیکھ رہا تھا۔

لیکن کھڑکیوں میں سے گرم مرطوب ہوا کے جھونکے نے آکر پھر میرے سامنے سارجنٹ کی اصلی لیڈی میک بیتھ کو دوبارہ پیش کر دیا۔ سامنے ایزل پر میرے ہاتھ کی کھینچی ہوئی نامکمل نقل تھی۔

زلیخا میرے اسٹڈیو میں چلی آئی وہ اس وقت ہلکے سبز رنگ کی ساڑی پہنے

تھی۔ اس وقت اس کی ساڑھی کے رنگ کے بعد صرف اس کی بھدی چال کا
میرے تخیل پر کچھ اثر پڑا ـــــ نہ بہت اچھا اور نہ خراب۔
اس نے بہت سادہ لہجے میں اپنے نتھنوں کی ایک جنبش کے ساتھ اس
طرح کہا کہ گویا وہ میرے ایزل کو مخاطب کر رہی ہے "نسیم، چلو میرے کمرے
میں چل کر ذرا مجھے ڈرائنگ کا کام پورا کر لینے میں مدد دو۔"
میں نے فوراً اپنا قلم قریب کے اسٹول پر رکھ دیا۔ اور اس کے ساتھ اس
کے کمرے میں پہنچا۔ ایک کوچ کے سامنے ایک چھوٹا سا اسٹول رکھا تھا جس پر
اس کی ڈرائنگ کی کاپی تھی۔
کوچ کے ایک سرے پر وہ بیٹھ گئی۔ اور دوسرے سرے پر مجھے بیٹھنے کا اشارہ
کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ اس مرتبہ میں پھر اس سے اسی قدر قریب تھا۔ اس کے جسم کی قربت
کے احساس سے میرے خون کی گردش تیز تر تھی۔ میں اپنے چہرے کی زردی مائل
سفیدی خود محسوس کر رہا تھا۔
میرے دل سے دھڑکنے کی آواز آ رہی تھی میرے عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا
تھا میں محسوس کر رہا تھا کہ میں ایک عورت سے اس قدر قریب بیٹھا ہوں۔ اور
بالکل تنہائی میں۔ اس وقت وہ مجھے ایک عورت معلوم ہو رہی تھی۔ گوشت و پوست کی ایک
نوجوان عورت۔ اس وقت فطرت اپنی پوری حکومت کے ساتھ میرے دل سے اس بہم
پیدا ہونے والے احساس کو زائل کر رہی تھی۔ کہ وہ میری چچازاد بہن بھی ہے۔

ہوس

معاشرت اور مذہب کے تمام تر قیود مجھے بے بنیاد اور غیر فطری نظر آرہے تھے فطرت نے سرشتِ انسانی کو آزاد بنایا ہے تو پھر یہ خود ساختہ پابندیاں کیوں؟

پھر میری طبیعت کی جمال پرستی اور جمالی تنقید نے ایک مجسمے کے لئے اس شباب کی آگ کو معتدل کر دیا۔ سر سے پاؤں تک میں نے زلیخا کو جمالیاتی نظروں سے جانچنا شروع کیا۔ اس کے موٹے موٹے بال جن کی چمک ان کی بے ہنگم یکجائی کو کچھ نہ کچھ قابل برداشت بناتی نظر آتی تھی لیکن خود اس کا بے ہنگم سر جو پشت، اور گردن کی پشت کی طرف اور زیادہ بدنما ہو گیا تھا۔ اس کی تنگ پیشانی اس کا سوکھا ہوا چہرہ، نیچے کا جبڑا کسی قدر ابھرا ہوا۔ پھر اس کا جسم جواب بھی کسی قدر روبہ نمو کر اس کے بے سرے نسوانی تناسب کو فنا کر رہا تھا۔ اور اس کے بالائی لب پر چھوٹے چھوٹے رویئیں، جو پاؤڈر کی ہلکی تہہ سے بغاوت کرتے معلوم ہوتے تھے۔

تو کیا نوجوان مصور ـــــ جو بزعم خود ایک دن ہندوستان کا تی تیان بننے والا تھا ـــ اپنے جمالی معیار کو اس بے ہنگم نسوانی شکل میں تلاش کرے گا۔

جمالی معیار؟ ـــــ وہ حقیقتِ منتظر جس کا لباس مجاز سے آشنا ہونا ممکن تھا ـــ نہیں۔ نوجوان مصور صرف ایک جمال پرست حسن کا رہنی ہی وہ انسان بھی ہے۔ اس میں انسانی جذبات بھی ہیں اس کی رگوں میں شباب کا گرما یا ہوا انسانی خون بھی ہے۔ اس کے پہلو میں ایک دھڑکتا ہوا دل بھی ہے، اس کے جنسی جذبات، دوسری جنس سے جنسی جذبات کے طلبگار ہیں۔

پہلی فضا

تو پھر یہ کیوں نہ کہا جائے کہ یہ بالکل مادی جنسی کشش ہے۔
یہ میرے تلبی خیالات تھے۔ میرے ظاہری حواس تو ڈرائنگ کی مشق کرانے میں مصروف تھے۔

ڈرائنگ کی اثنا میں کئی مرتبہ میری انگلیاں اس کی انگلیوں سے مَس کرتی ہوئی نکل گئیں۔ اس کا ہاتھ مجھ سے زیادہ سخت تھا میرا ہاتھ ایک حسن کار کا ہاتھ تھا جس کی نرم انگلیاں سینکڑوں حسین صورتوں کو پیدا کرتی ہیں۔ اس کے ہاتھ کی سخت ساخت اس کے عزم کا ثبوت دیتی تھی۔ اس کے ہاتھ نرم تھے لیکن ان کی سرخی میرے ہاتھوں سے مل کر گرمی بنتی ہوئی میرے سارے جسم میں سرایت کر رہی تھی۔

امینہ اور سلیمہ دونوں اس سے بدرجہا حسین تھیں۔ ان ہر حسن نسوانی تھا جمالی زاویہ نگاہ سے میں سلیمہ کو سب سے زیادہ پسند کرتا لیکن میرے جمالی معیار کے لئے میرے خیالی پیکر بہت کافی تھے۔ کوئی انسانی جسم میرے معیار جمال تک نہ پہنچتا تھا اس لئے جمالی معیار کو کسی عورت میں ڈھونڈھنے کی ضرورت نہ تھی میرا شباب صنف مقابل میں اپنا ہم آہنگ شعلہ محبت تلاش کر رہا تھا فطری محبت جو ہر قسم کے باطل دعوے سے پاک ہو۔ صرف ایک ہی محبت فطری محبت ہو سکتی ہے یعنی وہ محبت جو کسی مرد کو کسی عورت سے اس وجہ سے ہو کہ وہ عورت ہے۔

امینہ اور سلیمہ میں وہ زہریلی حرارت نہ تھی۔ زلیخا کے انتخاب کی ایک وجہ تو اس کی زہریلی حرارت تھی وہی زہریلی حرارت جس کی بدولت وہ مجھے عام عورتوں

ھوس

سے ممتاز ایک چلتی پھرتی لیڈی میک بیتھ نظر آتی تھی۔

ایک بات اور بھی تھی۔ وہ طفلانہ انس جو بچپن میں برادرانہ محبّت بن کر دل میں قائم رہا۔ اب بڑھتے بڑھتے شباب کی بغاوت کے بعد صنفی کشش کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔

خیالی زلیخا کی جگہ ــــ میرے بمبئی آنے پر ــــ گوشت و پوست کی زلیخا نے لے لی۔ تو پہلی مرتبہ طفلانہ معصومیت نے مادّیت کے ہاتھ کی خشک گرمی محسوس کی۔ پھر جب اس نمونۂ خلوص کی جگہ اور زیادہ مادی بلکہ افعی طبیعت زلیخا نے لے لی۔ تو مادّیت نے طفلانہ محبّت کو بالکل بدل کر ایک عجیب اور خطرناک کشش میں تحلیل کر دیا۔

پھر وہ قربت جو خون کو خون سے ہوتی ہے۔ اپنا جادو کئے بغیر نہ رہ سکی۔ میرے قلب نے یکلخت بلا کسی کشمکش کے اپنے صحیح مقصد کا اعتراف کر لیا۔ معاشرت اور مذہب کے خود ساختہ قیود ایک مصوّر کی نظر میں کیا وقعت رکھ سکتے ہیں۔

ڈرائنگ کی مشقیں پوری ہو چکیں اور میں اٹھ کر چلا آیا۔ مگر میں اپنے میں ایک تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے زندگی میں ایک قدم اٹھایا تھا ــــ غلط قدم ہی سہی۔ میں بہت دنوں تک سوچتا رہا۔ کہ میں نے محبّت کے لئے زلیخا کو کیوں انتخاب کیا؟ شاید نوجوان شاعرانہ طبیعت نے آگ اور زہر کے ساتھ کھیلنا زیادہ مناسب سمجھا کہ میں نے اپنی صنفی محبّت کے لئے اس لڑکی کو انتخاب کیا۔ جس کو اس سے

تمام واسطہ رکھنے والے لوگ انھیں جانگداز سمجھتے تھے

پھر میں نے خیال کیا محبّت؟ ـــــ مجھے زلیخا سے ہرگز "محبّت" نہ تھی۔ جنسی کشش کہنا زیادہ صحیح ہوگا ـــــ ممکن ہے اس کی وجہ اس کا وہ التفات ہو جو بچپن سے اب تک برابر میرے ساتھ رہا۔

خیالات کی تبدیلی کے ساتھ میں نے طے کیا۔ کہ "دونوں باتیں ہیں۔ اس کا باعث زلیخا کی طبیعت بھی ہے اور اس کی پرانی نگاہِ التفات بھی"

اور میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ کہ وہ ابھی تک مجھے بچّہ ہی سمجھتی تھی۔

کچھ ہی ہو۔ مجھے تو محبّت کرنے سے محبّت تھی۔ مجھے شباب کے باعث عشق سے عشق تھا۔ مجھے صنفِ مقابل سے ایک ہمدم تلاش کرنا تھا۔ جذباتِ نفسانی کا ہمدم نہیں، جذباتِ جنسی کا ہمدم۔ جذباتِ نفسانی اور جنسی جذبات کے زمین و آسمان کے فرق کو صرف ایک محسوس کرنے والا، محبّت کرنے والا ہی سمجھ سکتا ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں مَیں یہ کیوں نہ کہہ دوں کہ میں کوئی عارضی معاشقہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں عورت کی پائدار محبّت کا جویا تھا۔ اور اپنے تجربے کے لئے میں نے زلیخا کو انتخاب کیا۔ "سخاوت گھر ہی سے شروع ہوتی ہے"۔ خصوصاً ہمارے ملک میں جہاں معاشرت کو وہ ہر طرح کے نقصان پہنچاتا رہا ہے۔

میں مجبور تھا۔ مجھے اپنی ہم مرتبہ سوسائٹی میں لڑکیاں نہ مل سکتی تھیں جن میں اپنی طبیعت اور اپنی محبّت کا جواب ڈھونڈھنا چاہتا تھا۔ مجھے ناچار گھر

ہی میں ڈھونڈھنا پڑا۔

مصنوعی فطرت کی پابندی کو اپنا مذہب سمجھتا ہے میرا ارادہ مذہبی نقطۂ نظر سے، اخلاقی نقطۂ نظر سے معاشرتی نقطۂ نظر سے انتہائی برا سہی۔ مگر میں فطرت کا گنہگار نہ تھا۔

ان تمام امور سے قطع نظر میرا ارادہ پاک تھا میرے جذبات بالکل نفسانی اور بہیمی جذبات نہ تھے جنسی محبت سے میرا مقصد یہ تھا کہ میں اس کو دیوی نہیں بلکہ عورت سمجھ کر محبت کروں لیکن نہ اس قدر خود غرضی سے کہ میں اس ناکتخدا لڑکی کی زندگی اپنی ہوس پر قربان کر دوں۔

ممکن ہے آپ اسے عذرِ گناہ بدتر از گناہ قرار دیں۔ ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ مجھے اپنے جذبات پر قابو نہ رہتا۔

ممکن ہے آپ کا خیال درست ہو۔

ممکن ہے کہ میں آگ سے کھیل رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن خیر اب آگ کا کھیل شروع ہو چکا تھا۔

دوسری فضا

(۱)

لیڈی میک بیتھ کی تصویر مکمل ہو چکی تھی۔ جمیل ٹینس سوٹ پہنے آیا۔ اور تصویر کو دیکھ کر ہنس کر کہنے لگا۔

- نسیم تم نے غور نہیں کیا۔ اس کا چہرہ زلیخا سے کسی قدر مشابہ ہے؟

تصور کے دھوکے نے کیا فی الحقیقت میرے ہاتھ پر، میرے موقلم پر اس قدر جادو کر دیا تھا۔ کہ غیر ارادی طور پر لیڈی میک بیتھ کی اس تصویر میں زلیخا سے کچھ مشابہت پیدا ہو گئی تھی۔

میں نے اس طرح دفعتاً پکڑے جانے پر خجالت کے کچھ قطرے اپنی پیشانی پر محسوس کئے۔ جمیل نے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پھر بے خیالی کی ہنسی ہنس کر اپنی مٹھی بند کر لی۔ اور مجھے کہا: "دیکھو اس میں میں نے زلیخا کی روح قبض کر کے بند

کرلی ہے" اور یہ کہہ کر اس نے اپنی مٹھی میرے قمیص کی جیب میں ڈال کر کہا "یہ رُخ تمہارے پاس سے اُڑنے نہ پائے"

یہ عجیب قسم کا مذاق، مجھے اس وقت ایک شگونِ نیک معلوم ہوا۔

جمیل نے سنجیدہ ہو کر کہا "چلو گے نہیں؟"

میں نے جواب دیا "نہیں بھئی۔ آج طبیعت کچھ سست ہے۔ آج میں ٹینس نہ کھیل سکوں گا۔ تم جاؤ"

وہ کچھ ہنستا، کچھ گنگناتا چلا گیا۔ میں نے اینل پر سے کینوس کو اکھیڑ کر پھاڑ کر لیڈی میک بیتھ کی تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

زلیخا اور سلیمہ میرے کمرے میں آئیں .... امینہ کی شادی اس اثنا میں ہو چکی تھی، جس کی تفصیل سے ہم کو سروکار نہیں..... زلیخا نے میری تصویروں کو پھر اسی شوق سے دیکھا۔

"نسیم تم نے خود ابھی کسی کی تصویر نہیں اتاری"

میں نے جواب دیا "نہیں ابھی تک صرف نقلیں کر رہا ہوں"

اس نے شوق کے لہجے میں کہا "کیوں تم میری تصویر کھینچو گے؟"

میری نبض کی رفتار تیز تر ہو گئی۔ میں نے جواب دیا "مگر چچا جان اجازت نہیں دینگے"

اور اس نے اس طرح جواب دیا۔ گویا اس کے ہاتھ کی بات تھی "اجازت میں خود اجازت لے لوں گی"

سلیمہ کی لطیف، معصوم، طفلانہ ہنسی نے درمیانی وقفے میں لطافت کی تھوڑی سی لہر پیدا کر دی۔ کچھ اور باتیں کر کے وہ دونوں چلی گئیں۔

اسی شام کو مجھے معلوم ہو گیا۔ کہ چچا جان نے زلیخا کو تصویر کھنچوانے کی اجازت دیدی ہے۔ میں نے دوسرے دن سے تصویر کھینچنے کا وعدہ کر لیا۔

رات کو جمیل نے مجھے یہ شعر کئی مرتبہ پڑھتے ہوئے سنا۔

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری　　تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے

اس نے کہا "خدا خیر کرے" اور ہم دونوں ہنسنے لگے۔

(۲)

میں نے اس کے لئے موزوں ترین لباس اور نشست کا بہترین طریقہ انتخاب کیا۔ میں آرٹ اسکول سے واپس آیا۔ تو اس نے تقاضا شروع کیا۔ پندرہ منٹ میں تازہ دم ہو کر اس محبت کی محبت کے لئے میں تیار ہو گیا۔

زلیخا سیاہ لباس میں ایک دلفریب نشست میں میری ان آنکھوں کو جو محبت کرنا سیکھ رہی تھیں ایک غیر معمولی خوبصورت شئے نظر آ رہی تھی۔

میں اپنے موقلم کو کینوس پر حرکت دے رہا تھا۔ میں اپنی پوری قوتِ عمل سے جو خیالی پیکر تیار کر رہا تھا اس کو ان تمام نظری خامیوں سے بلند وارفع بنانا چاہتا تھا۔ جو اس گوشت و پوست کی زلیخا میں موجود تھیں۔

محسوس

مگر میرے قلب کی، میرے رجحان کی تبدیلی نے موقلم کی گردش کو یک لخت روک دیا میں لیڈی میک بیتھ کے بدلے دھوکے سے اوفیلیا کی تصویر اتارنے لگا تھا میں نے اپنی غلطی محسوس کی۔ ایک فن کار کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ میں زلیخا کی نہیں کلیوپیٹرا کی تصویر اتاروں۔

میں نے اینزل پہ سے تصویر اتاری۔ اور اس مرتبہ پھر کینوس کو پھاڑ پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ زلیخا میری طرف تعجب سے دیکھ کر ہنسنے کی کوشش کر کے کہنے لگی "ارے۔۔۔۔"

میں نے کہا۔ تصویر بالکل بگڑ گئی تھی۔"

پھر میں نے سارجنٹ سے اس کی پنڈی، نہر یلی نقاشی میں مدد لینے کی کوشش کی اور زہر بھری زلیخا کی تصویر اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔

نصف گھنٹہ کی محنت کے بعد میں تھک گیا میں نے موقلم ہاتھ سے رکھ دیا زلیخا اسی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ میں جا کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

انسانی اور جنسی کشش جو فنی مصروفیت اور سرگرمی میں اب تک صرف بیک گراؤنڈ کا کام دے رہی تھی۔ اب میرے قلب میں میرے خون کی گردش میں سرایت کرنے لگی میں محسوس کرنے لگا۔ کہ میرے چہرے کا رنگ زرد ہو رہا ہے۔

زلیخا نے پاس سے ایک کتاب اٹھا کر دیکھنا شروع کی۔ یہ وزیبی کی تصاویر کا مجموعہ تھا میری سانس کسی قدر پھول رہی تھی میں نے زلیخا کو کچھ سمجھانے کی کوشش

کی میں اس مرتبہ — پہلے سے بہت زیادہ اس کی قربت، اور — تنہائی کو محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اپنے جسم میں خون کی تیز روانی کے ساتھ ایک خفیف سی لرزش محسوس کی۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں کتاب تھی، میں اس کو کسی تصویر کے متعلق کچھ سمجھا رہا تھا۔ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے مَس کرتا ہوا نکل گیا۔ دوبارہ میں نے عمداً اپنے ہاتھ کو اس طریقے سے کتاب کے قریب رکھا کہ وہ برابر اس کے ہاتھ سے متصل رہے ایک برقی لہر، اس کے ہاتھ سے نکل کر میرے ہاتھ سے ہوتی ہوئی میرے جسم بھر میں دوڑ گئی۔ میں نے اپنے جسم میں ایک کمزور لرزش محسوس کی۔ اپنی اس اعصابی کمزوری پر میں دل میں بہت جھنجلایا۔

اب شاید وہ میرے جذبات سے کچھ آگاہ ہو چکی تھی۔ لیکن اس نے اپنا ہاتھ ہٹایا نہیں۔ شاید اس حالت کو اس نے بے پرہیزی کا ایک گزرتا ہوا لمحہ خیال کیا۔ ایک خفیف۔ سا ارتعاش میں نے اس کے بدن میں بھی دیکھا۔

شباب نے اس سے بہت دور کا نتیجہ نکالا۔ میرا ہاتھ کتاب سے ہٹ کر اس کی کرسی کے دستے پر پہنچ گیا۔ میری زبان تصویروں کے متعلق بے معنی الفاظ کہہ رہی تھی۔ میرا ہاتھ آہستہ آہستہ حرکت کرتا ہوا اس کے جسم سے قریب تر ہو رہا تھا۔ میری زبان کو الفاظ پر قابو نہ تھا۔ میرے چہرے کو اپنے رنگ بدلنے پر اختیار نہ تھا۔ میرے جسم کا اپنی لرزش پر کوئی زور نہ چلتا تھا۔

پھر ایک اور خفیف سا ارتعاش میں نے سر سے پاؤں تک لیکن اس کے جسم میں طاری

ہوتا پایا۔

میرا ہاتھ اس کے بازو سے مَس کر رہا تھا۔ اب میرے خون کی گردش بڑھ گئی۔ میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ جسم کی لرزش ایک انتہا کو پہنچ کر بند ہو گئی۔ میں نے ایک خوفناک مسرت کی طوفانی لہر اپنے سارے جسم میں محسوس کی۔ میرا ہاتھ اس کے بازو پر تھا، میری گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔

کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ جذبات نے اسے ایک لمحے کے لئے بے قابو کر دیا۔ میرا دوسرا ہاتھ اس کے بائیں رخسار پر تھا۔ اور میں اس کے دائیں رخسار کی جانب جھک رہا تھا۔

دفعتاً اس کی ساری نسوانیت کئے ساتھ اس کی نسوانی نخوت، اس کی بلندی عود کر آئی۔ حجاب جو ہندوستانی لڑکیوں کے جذبات کے لئے ہمیشہ زنجیر پا بن جاتا ہے۔ اس وقت اس کا ساتھ دے گیا۔ اور اس کی نسوانی نخوت! ــــــ

"نسیم یہ کیا ہے"۔ اس کے لہجے میں میری جرأت پر غصہ تھا۔ اپنی ہتک پر تکبر تھا۔ اپنی کمزوری پر نخوت تھی۔ پھر بھی اس کے لہجے میں جلا دینے والی گرمی نہ تھی جذبات کے اسی فوری عروج نے اسے بھی کچھ نہ کچھ بے قابو کر دیا تھا۔

میں فوراً ٹھٹک گیا۔ میرے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ گویا میرے ذہن پر دفعتاً بجلی گری۔ اسی مفلوج حالت میں چند سیکنڈ گذارنے کے بعد میں اٹھا۔ اور میں نے ایک جنون آمیز جذبے میں بلا معافی مانگے ہوئے صرف اتنا کہا میرے سر میں درد

ہوًا ہے، میں اس وقت تفریح کرنے جاتا ہوں کل پھر تصویر اتارنے کی کوشش کرونگا۔"
اس نے صرف سر کی ایک جنبش سے جواب دیا، میں نے چلتے ہوئے اس کے چہرے سے اس کے دل کے جذبات پڑھنے کی کوشش کی۔ اس کے کھنچے ہوئے رخساروں، جھکی ہوئی آنکھوں سے کچھ نخوت، کچھ خجالت، کچھ تاسف اور کچھ تکبر کا اظہار ہوتا تھا۔
وہ اسی طرح کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کی نشست میں ذرا سا بھی فرق نہ آیا تھا۔
میں باہر نکل گیا۔ دروازے کے پاس شگفتہ ہوا میرے تھکے ہوئے دماغ سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی "نسیم، یہ کیا ہے"

۳

میں نیچے اتر رہا تھا۔ جمیل زینے پر ملا۔
جمیل نے کہا "کہاں چلے؟"
میں نے جواب دیا "یوں ہی ذرا تفریح کو"
جمیل نے ہنس کر کہا "کہاں چلے؟" ——— میں نے کہا "کہیں نہیں۔"
پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے سنجیدگی سے کہا "کیوں نسیم آج تم کچھ اداس ہو"

میں نے جواب دیا "نہیں بھئی یونہی طبیعت سست ہے۔"
"چلو سینما دیکھنے چلو گے۔ ویلنگٹن میں "بری لڑکی" ہے۔"

میں نے پھر کہا "نہیں بھئی آج میں شہر سے باہر تفریح کو جانا چاہتا تھا، پھر کبھی چلیں گے۔"

جمیل نے کہا "اچھا" اور پھر وہ بیڈ گرل۔ بری لڑکی۔ بیڈ گرل گنگناتا ہوا اوپر چڑھ گیا۔ نیچے اترتے ہوئے مجھے یک لخت خیال آیا۔ کہ فلم کے نام نے میری متنفر توجہ کو زلیخا کی طرف مبذول کر دیا ہے۔

پھر مجھے ایک گہری تیز زنانہ آواز بار بار دہراتی سنائی دینے لگی "نسیم یہ کیا ہے! نسیم یہ کیا ہے! نسیم یہ کیا ہے!"

میں جلدی جلدی اتر کر سڑک پر پہنچ گیا۔

۴

"نسیم یہ کیا ہے؟ ... نسیم یہ کیا ہے؟"

میں نے اپنی پیشانی کو زور سے دبایا۔ میرا دماغ سنسنا رہا تھا۔ میں نے ایک ٹیکسی والے کو آواز دی اور کہا "جوہو چلو"

رات کا اندھیرا بمبئی کی عریض سڑکوں پر روشنی کے طوفان میں چھپتا پھر رہا تھا میں اس وقت اس خلاف توقع واقعے سے بالکل اپنے قابو میں نہ تھا۔ کتراتی ہوئی موٹریں، ٹرام گاڑیاں، پیچھے دوڑتی ہوئی عمارتیں ... میں چاہتا تھا کہ کسی طرح جلد سے جلد اس انسانی جنگل سے نکل جاؤں۔"

دوسری فضا

نسیم یہ کیا ہے!"

میرا ذہن پھر کُند سا معلوم ہونے لگا۔ میرے قلب میں ایک پستی طاری ہونے لگی۔ گو عمارتوں اور دکانوں پر جو برقی روشنی میں نام لکھے تھے۔ ان میں سے بھی کسی ایک کا مضمون یہی تھا۔ نسیم یہ کیا ہے۔"

بمبئی کی سڑکوں کے شور سے زیادہ واضح آواز مجھے زلیخا کی گہری آواز معلوم ہو رہی تھی ——— وہی گہری آواز جس کو وہ اپنی بے ہنگم سر کی ذرا سی جنبش کے بعد لہجہ بنا بنا کر کہا کرتی۔ تو میں اس کو دنیا کی سب سے شیریں آواز سمجھتا۔

میری امیدوں، آرزوؤں کا قلعہ چشم زدن میں منہدم ہو چکا تھا۔ آہ شباب کے بے خود غلط مفروضات! میں یہ سمجھ رہا تھا ——— اس کے نرم لہجے اس کے مصنوعی اخلاق سے میں یہ سمجھ رہا تھا۔ کہ وہ بھی مجھے چاہتی ہے۔ اس کی چاہت محبت میں تبدیل ہو جائے گی۔

پھر میں سوچنے لگا میرے مفروضات غلط تھے۔ اور یقیناً غلط تھے۔ عمر کا فرق ——— وہ مجھ سے عمر میں کافی بڑی تھی۔ میں حقیقت میں اس کے سامنے بچہ ہی تھا۔ ممکن ہے کہ وہ مجھ سے یہ توقع نہ رکھتی ہو۔

میں نے اس خیال کو اپنے دل سے نکال دینا چاہا۔

مگر اب بھی امید و آرزو کا ایک چراغ میرے دل میں ٹمٹما رہا تھا۔

۵

رات کو گھر میں سے سب کہیں دعوت میں گئے ہوئے تھے۔ جمیل سینما سے ابھی تک واپس نہ آیا تھا۔ کھانے کے میز پہ چچا جان کے ساتھ صرف میں تھا۔

کھانا کھاتے کھاتے انہوں نے میری طرف دیکھ کر شفقت سے سوال کیا "تمہاری صحت تو اچھی رہتی ہے ؟"

میں نے دھیمی آواز میں جواب دیا "جی ہاں "

اس پر انہوں نے سر اٹھا کر کہا "آج معلوم ہوتا ہے۔ کہ تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں "

میں نے پھر اسی ادب سے جواب دیا "جی کچھ نہیں "

وہ خاموش ہو گئے۔ اور میں غور کرنے لگا۔ یہ میرے چچا تھے۔ میرے محسن تھے میں ان کی تباہی کا، ان کے گھر کی بربادی کا سامان کر رہا تھا۔ اگر ان کے دل میں خفیف سا بھی شک گزر جاتا ؟

ان کے خواب خیال میں بھی میری نسبت ایسا خیال نہ ہوگا۔ اور میں آج ہی شام کو ان کی لڑکی سے تعشق کی کوشش کر رہا تھا۔ کیا مجھے دیکھ کر کوئی شخص اس سیاہ دلی کا کچھ بھی اندازہ کر سکتا ؟

اس وقت میں اپنے آپ کو ایک قابل نفرت ہستی محسوس کر رہا تھا۔ بزعم خود میرا طریقۂ محبت بہت زیادہ مہذب بہت زیادہ شریفانہ سہی لیکن

اگر نفسی تجزیہ کیا جاتا۔ تو مجھ میں اور ایک ہوس پرست بدمعاش میں کیا فرق تھا۔

اور جمیل جو مجھے اپنا بھائی اپنا دوست سمجھتا تھا۔ کیا اس کو مجھ پر ذرا سا بھی شبہ ہو سکتا تھا۔ اس کے دل میں کبھی میری جانب سے ایسا خیال بھی نہ گزرا ہوگا۔ اور میں نے حقیقت میں آج ہی اس کی بہن سے معاشقہ کی کوشش کی

پھر میرے قلب نے غیر معمولی طور سے مجھے تسکین دی۔ تصویر سیہ کاری کو مٹا کر اس کی جگہ محبت کی تصویر قائم کرنا چاہی۔

میرا ضمیر دنیا کے مشاہدے سے اور دوسروں کے تجربے سے بہت کافی سبق لے چکا تھا۔ یہ کوئی ایسی قابل شرم غلطی نہ معلوم ہوتی تھی۔

اور میرا کیا قصور تھا۔ پردے نے دوسرے تمام مسلمان گھروں کے دروازے بند کر دیئے تھے۔ پردے نے مسلمان لڑکوں کو قید کی وجہ سے بہت زیادہ حساس بنا دیا تھا۔ پردے نے مسلمان لڑکوں کو نسوانی صحبت سے محروم کر کے ان کے اخلاق کی شائستگی کو پامال کر دیا تھا۔ پارسی اور ہندو لڑکیاں ہم لوگوں سے الگ رہتیں۔ ان سے ملاقات صرف بہت دور کی ملاقات تک محدود رہتی۔ اپنے ہم قوم اور ہم مذہب لوگوں میں جو یگانگت محسوس کی جاتی ہے۔ اس سے ہم قطعاً عاری تھے۔

تو پھر اپنے ہی خاندان کی لڑکیاں ـــــ جن سے نکاح جائز ہو سکتا تھا تو پھر محبت بھی جائز تھی۔

مجھے اس کا بھی احساس تھا کہ طفلانہ خیالات کی دنیا اور عملی دنیا میں نہیں

وآسمان کا فرق ہے۔ مگر جذبات کے طوفان کے آگے اس قسم کے عقلی نتیجے کیوں کر قائم رہ سکتے ہیں۔

وہ لوگ دعوت سے واپس آئے۔ او رچچی کھانے کے کمرے میں آکر بیٹھ گئیں وہ میرے چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ کیا ان کو میری نگاہوں میں یا میرے چہرے کے رنگ میں کوئی خاص بات نظر آرہی ہے۔

اس کا تو مجھے کامل یقین تھا۔ کہ آج کے واقعات کا زلیخا کسی سے ذکر کر ہی نہیں سکتی۔ اس کے زہریلے حملے اگر مجھ پر یوں گے بھی تو براہِ راست نہ ہونگے۔ اس ذکر میں اسے خود اپنے قصوروار ٹھہرائے جانے کا ایک خفیف سا خوف ہوگا۔ اور اس کے علاوہ ایک کنواری پردہ نشین لڑکی کا حجاب ـــ

باوجود وقتی ناکامی کے اب تک میری فتح تھی . . . .

لیکن میرے چہرے پر مردنی سی چھا رہی تھی۔ سب کی نگاہیں میری طرف بار بار پڑتی تھیں ممکن ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ ہو ممکن کہ صرف میرا خیال مجھ کو پریشان کر رہا تھا۔

۶

دوسرے دن اندرونی ڈرائنگ روم میں زلیخا اور سلیمہ دونوں کچھ پڑھ رہی تھیں۔ مجھے آتے دیکھ کر سلیمہ نے پھر اپنی وہی معصوم شگفتہ ہنسی ہنس کر کہا کیوں

کیا آج تم زلیخا کی تصویر نہ کھینچو گے "

میری نظریں زلیخا کی طرف پلٹیں۔ خجالت کا سرخ زرد رنگ اس کے چہرے پر نمایاں ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے چہرے پر کچھ جذبات کی سرخی، کچھ خجالت کی زردی محسوس کی۔ اور اس کے بعد پھر میں نے ایک کوشش کے ساتھ سنجیدہ استقلال کے آثار اپنے چہرے پر پیدا کرنے چاہے۔

زلیخا نے جھکی ہوئی نظروں اور اڑے ہوئے رنگ کے ساتھ کہا "اچھا میں ابھی تیار ہوتی ہوں "

سلیمہ نے پھر اسی معصوم ہنسی اور معصوم سر کی جنبش کے ساتھ کہا "میں بھی آج تم کو تصویر کھینچتے دیکھوں گی "

میں نے اس کا خیال نہ کیا۔ تو کیا وہ جملہ "نسیم یہ کیا ہے !" صرف نسوانیت کی ایک ادا تھی۔ کیا صرف تقاضائے حجاب نے اسے یہ کہنے پر مجبور کیا تھا۔ کیا پھر وہ میری جرأت کو دوبارہ بڑھانا چاہتی تھی ؟

مجھے یقین ہو چکا تھا۔ کہ وہ تصویر نہ کھنچوائے گی۔ وہ مجھ سے کشیدہ رہے گی۔ اور مجھ سے کھنکتی رہے گی۔

لیکن اب وہ پھر ادھر ادھر کی باتیں اس طرح کرنے لگی۔ جیسے کوئی بات پیش ہی نہ آئی تھی۔ یورپ میں بھائی جان کی کامیابی جبیل کی برائیاں اور خدا جانے کیا کچھ ؟

اور میں بھی چند لمحے تک یہی سمجھنے لگا۔ کہ بات آئی گئی ہوئی۔

زلیخا تصویر کھنچوانے کے لئے کپڑے پہننے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ سلیمہ اسی معصومیت سے ہنستی ہوئی سر کی جنبش سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہوئی میرے سٹوڈیو میں چلی آئی۔ اس کے نرم بھورے بال اس کے شانوں پر پھیلے ہوئے تھے۔

میں نے اپنی محبت کے لئے اس حسین لڑکی کو کیوں نہ انتخاب کیا۔ وہ عمر میں بھی مجھ سے قریب تھی، وہ خوبصورت تھی اور بہت خوبصورت۔

لیکن اس کی معصومیت، اس کا چہرہ خود ہر بری نظر کو واپس لوٹا دیتا۔ وہ ایسی چیز تھی۔ جسے صرف دور سے دیکھتے رہنے کو طبیعت چاہتی۔ اگر کوئی اس سے اظہارِ عشق کرتا، تو غالباً پہلے ہی فقرے پر اس کا بھولا بھالا دل جھوٹے الفاظ پر ایمان لے آتا۔ فریب کے جال میں اس کا پھنسنا انتہائی سہل تھا لیکن اس کے چہرے کی معصومیت اس کی تنہا حافظ تھی۔

اور ذاتی حد تک میں یہ بھی کہوں گا۔ کہ زلیخا میں وظاہری باتیں بھی ایسی تھیں جو اس لڑکی میں ــــــ سلیمہ میں نہ تھیں۔ زلیخا عمر کے اس حصے میں تھی جب کوئی لڑکی خام لڑکی نہیں رہتی۔ اس کی نسوانیت پختہ ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے سے اس کی پختہ نسوانیت کا اظہار ہوتا تھا۔ سلیمہ اس سے دو سال چھوٹی تھی۔ اس میں ابھی نسوانی کمال پختہ ہونے نہیں پایا تھا۔ طفلانہ پن اس کے چہرے پر اس کی ہنسی میں اس کی بات چیت میں اس کی ہر جنبش میں بہت زیادہ نمایاں تھا ــــ مطلب یہ تھا کہ

دوسری فضا

زلیخا میں سلیمہ سے بہت زیادہ نسوانیت تھی۔

پھر یہ کہ زلیخا نسائیت کے ساتھ دل و دماغ بھی رکھتی تھی۔ اس میں زندگی کی آگ تھی وہ سلیمہ کی طرح ایک مہکتا ہوا پھول نہ تھی جس کی ساری خوشبو، سارا حسن صرف اس وقت تک تازہ و دلفریب معلوم ہوتا ہے جب تک وہ شاخ سے توڑا نہ جائے۔

مجھے اس کے بعد ہارڈی کی تقسیمِ حسن یاد آگئی۔ نسوانی حسن کو اس نے دو قسموں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک ملکوتی حسن اور دوسرا شیطانی حسن۔

ان میں سے سلیمہ میں ملکوتی حسن تھا۔ مگر ملکوتی حسن کی کشش جذباتی کشش نہیں ہوتی۔ ملکوتی حسن کی پرستاری کے حقیقی لطف کا مطلب یہ ہے۔ کہ دور سے دیکھا کیے کوئی۔ سلیمہ کا حسن اگر اثر کر سکتا تھا۔ تو صرف جمالی فہم پر۔

اگر زلیخا میں حسن ہوتا تو غالباً شیطانی قسم کا۔ لیکن اس کی نسوانیت، جو اس کے حسن کی تلافی کرتی تھی۔ اب بھی ابلیسیت لئے ہوئے تھی۔ اگر اس میں صرف ابلیسیت ہوتی۔ تو شاید اس سے بھی روح کو بہت دور کا تعلق رہتا۔ . . لیکن زلیخا میں ایک اور شے تھی جس کو میں پہلے "زندگی کی آگ" سے تعبیر کر چکا ہوں۔

سلیمہ اس اثنا میں میری کتابوں میں کچھ تصویریں دیکھ رہی تھیں۔ اور پھر چند کتابیں انتخاب کر کے وہ کمرے کے ایک سرے پر ایک آرام کرسی پر جا بیٹھی۔ میں تصویر کھینچنے کا سامان درست کر رہا تھا۔

ہوس

زلیخا آئی۔ اسی نشست سے، میرے تصویر کھینچنے کا انتظار کرنے لگی۔ سب سامان ٹھیک کر کے میں ایزل کے پاس پہنچا۔

نصف گھنٹے تک میں تصویر میں رنگ بھرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس اثنا میں میں نے مڑ کر زلیخا کی طرف دیکھا۔ اس کے سینے کے کچھ حصے سے کپڑا ہٹ گیا اور اس کے سینے کا بالکل بالائی حصہ قمیص کے کھلے ہوئے گلے میں سے عریاں نظر آرہا تھا۔

میرا موقلم، برش تصویر پر لغزشیں کرنے لگا۔ میں نے اپنی کنپٹیوں کے پاس خون کی حدت محسوس کی۔ گویا میں زمین سے اٹھ رہا تھا۔ زمین سے میں بلند ہو رہا تھا۔ میرا سارا خون میرے سر میں امڈا چلا آرہا تھا۔ میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا رہا تھا۔ جذبات کی اس حدت سے میرا رنگ بدل رہا تھا۔

میں نے ایک دزدیدہ نظر سے سلیمہ کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح کتابوں اور تصویروں میں مشغول تھی۔ اسی پر جذبات چہرے سے میں نے زلیخا کی طرف دیکھا۔ میرے چہرے کی آگ سے غالباً اس نے دل کی آگ کا اندازہ لگالیا۔ اور خود بخود بسبب کو تلاش کرتے ہوئے اس کی نظر نے اپنی گردن کی عریانی کی ایک جھلک دیکھ لی۔ اس نے ساری کا آنچل برابر کر لیا۔

پھر مجھے ایک خفیف لرزش اس کے جسم میں طاری ہوتی نظر آئی۔

میں ایک ہاتھ سے اپنی پیشانی دبائے ہوئے تھا۔ سلیمہ نے اپنی بڑی بڑی معصوم

دوسری فضا

آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر کتابوں میں غرق ہوگئی۔

زلیخا نے حجاب و خجالت کو مٹا کر بے پروا لہجے میں یہ کہنے کی کوشش کی "اگر تھک گئے ہو تو آج رہنے دو۔"

میں نے کہا "جی اچھا۔"

وہ اٹھ کر سلیمہ کے قریب ایک اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور سلیمہ کی جمع کی ہوئی کتابیں دیکھنے لگی۔

جمیل شگفتہ چہرے کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ان دونوں کو موجود پاکر ذرا ٹھٹکا۔ پھر میری طرف بڑھا میں کمرے کے دوسرے سرے پر اپنے ایک پنسل اسکیچ کو درست کر رہا تھا۔ آتے آتے وہ ایزل کے سامنے رکا۔ اور زور سے قہقہہ مار کر کہنے لگا

"اخاہ! بی زلیخا کی بھی تصویر اتاری جا رہی ہے۔"

زلیخا نے غصّے کے لہجے میں بگڑ کر کہا "تو پھر تم کیوں جلتے ہو؟"

جمیل نے کہا "ہاں اب آپ سے جلنے والا ایک میں ہی تو رہ گیا ہوں اچھا اب تشریف لے جائیے۔ مجھے نسیم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

زلیخا نے کہا "کیا؟"

اس نے کہا "ذرا آپ اس کمرے سے تشریف لے جائیے" اور پھر وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

زلیخا نے بگڑ کر کہا "شرم نہیں آتی۔ اتنا بڑا ہوگیا۔ اور اب تک برابر ایسی

بدتمیزی کرتا جاتا ہے۔ تو بھلا مجھ پر کیا حکومت کرے گا۔ اماں جان کے لاڈ پیار نے آخر اسے بگاڑ ہی ڈالا۔"

جمیل برابر ہنستا رہا۔ اور سلیمہ نے پھر اسی معصوم ہنسی کے ساتھ کہا۔"جمیل بڑی بہنوں سے اس قدر بدتمیزی مت کیا کرو۔"

جمیل ہنستا رہا۔ اور پھر میرے قریب آ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا "نسیم دیکھو۔ آج فرانکن سٹائن دیکھنے ایکسلسیئر چلنا ہے۔"

میں نے کہا۔"اچھا۔"

اس نے جاتے جاتے جھک کر زلیخا سے کہا۔"زلیخا صاحب کو سلام۔" اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

زلیخا نے پہلے بگڑ کر کہا۔"دور ہو شیطان۔" پھر وہ اور سلیمہ دونوں ہنسنے لگیں، میں بھی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔

زلیخا اٹھی اور میری کتابوں کی ایک الماری کھول لی۔ چلتے وقت اس کے سر کی بے ہنگم شکل اور زیادہ نمایاں تھی۔ اس کا جسم، اس کی چال کی وجہ سے اور زیادہ بدنما معلوم ہو رہا تھا۔ یہ شعر میری زبان تک آتے آتے رک گیا۔

مری نظر نے عجب کار لاجواب کیا
کہ تجھ کو لاکھ حسینوں میں انتخاب کیا

مگر یہ ظرافت کی جھلک ایک لمحے میں فنا ہو گئی۔ کتابیں نکالتے میں اس کے جسم

کی ایک مکمل جنبش نے میری نظروں کے سامنے ایک عورت کے جسم کا جیتا جاگتا تصور پیش کر دیا۔

اور اس کے بعد میں دزدیدہ نگاہوں سے برابر اس کو دیکھتا رہا۔ تصویر کھنچوانے کے کپڑے اس کے جسم پر بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ اس کے جسم کی جھلکی کی بدنمائی اس میں کچھ چھپی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

دفعتاً میرے ذہن نے پہلی مرتبہ ایک نئی چیز کا پتہ چلایا۔ آرزو... میں عریانی زیادہ نمایاں... دھواں دھار غازہ کیوں؟ اس کو گھر سے باہر کہیں جانا نہ تھا۔ صرف اپنے کے... تھی۔ نہ آج کسی مہمان یا ملنے والے کے آنے کا امکان تھا۔

آخر اس جنگ زرگری کا مدعا کیا تھا؟

کیا وہ مجھے برابر اپنا اسیر رکھنا چاہتی ہے۔ کیا وہ لڑکی جسے پردہ کی چار دیواری کے باہر جانا نصیب نہ ہوا تھا۔ یہ چاہتی ہے۔ کہ اس اسیری میں بھی کوئی اس کی ہستی کی جنسی جمالی نقطۂ نظر سے قدر کرتا رہے۔

حجاب اس کو روکتا تھا۔ تو جذبات جو قید کی وجہ سے اور حساس ہو گئے تھے۔ اس کو اکساتے تھے۔ نسوانی نخوت اس کے لئے سدِّ راہ بنتی تھی تو نسوانی صنفیت اس کو مشتعل کرتی تھی۔

اس غریب کی حالت مجھ سے بھی زیادہ قابلِ رحم تھی — میں آگ سے کھیل رہا تھا اور آگ کا کھیل شروع ہو چکا تھا۔

اس کے حجاب نے اس کی شرم نے اس کی نخوت نے میری گستاخی کا وقتی
طور پر ایک غیر ارادی مقابلہ کیا تھا۔ وقتی طور پر مجھے روکنے کی ایک نامکمل کوشش کی تھی
آہ۔ انسانی کمزوریاں.... اسے خود اپنے اوپر اختیار نہ تھا۔ اور ہوتا بھی تو کیہ
اندیشی کو اس قیدِ سخت نے ایک جبری بلا بنا کر ہمیشہ اس کے سر پر مسلّط رکھا
قلب ردِ عمل کے لئے بیتاب تھا۔ قلب کی شورش کے آگے اس کے
نسیم ہی نہ چل سکتی تھی۔
نہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید اس میں ترغیب ہوس کی اتنی بھی مقاومت

ہی۔

اور اس کے ساتھ میری ساری نفسانیت، میری ساری قوتِ عمل پھر ایک بار
ہ ہو گئی۔ پھر میں ایک بیتابی محسوس کرنے لگا۔ میرے جذبات و احساسات میں
مادیت اور سرایت کر گئی۔

پھر اس کی کمزوری کی وجوہات اور بھی تھیں۔ اس کی عمر بائیس سال کی ہو
چکی تھی۔ ایک لڑکی کا بائیس سال کی عمر تک ناکتخدا رہنا، اور پھر اس قید میں خدا جانے
کتنے ارمان کتنی آرزوئیں، کتنی تمنائیں، کتنے جلا دینے والے جذبات کتنی مضطرب
کرنے والی بیتابیاں اس کے سینے میں مچل رہی ہوں گی۔

میں اپنے سلسلۂ خیالات میں محو تھا۔ میرے ہاتھ پنسل اسکیچ کے ساتھ مصروف
تھے جو توجہ کے فقدان کی وجہ سے بالکل اکارت ہو چکا تھا۔ میں نے اس کو پھاڑ کر

کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

اور اب میں نے مڑ کر دوسری جانب دیکھا سلیمہ جا چکی تھی۔ زلیخا اسی انہماک سے وہ کتاب پڑھ رہی تھی۔ گویا اسے یہ بھی خبر نہ تھی۔ کہ وہ کہاں بیٹھی ہوئی ہے۔ ساری کا آنچل پھر اس کے کندھے پر سے ڈھلک گیا تھا۔ اس کے قمیص کے پورے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اور اس کے شفاف سینے کا درمیانی حصہ ایک تنگ خطی صورت میں گردن سے دس انچ نیچے تک برابر عریاں تھا۔ بالائی حصے میں عریانی بہت زیادہ تھی۔ اس کے تنفس کے ساتھ اس کے سینے کا اتار چڑھاؤ زیادہ نمایاں معلوم ہوتا تھا۔ تنفس کے ساتھ قمیص کے گلے کی چوڑائی بڑھتی جاتی تھی۔ اور اس کے سینے کی عریانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

پھر میں اپنے جسم میں خون کی کوندتی ہوئی بجلیاں پا رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ بڑھ کر ماڈیل کے اس طرف ایک کرسی کے دستے کے سہارے سے بیٹھ گیا۔ میرا پورا جسم اس کی نظروں سے چھپا ہوا تھا۔ میں اس سے بہت قریب تھا۔ بمشکل ایک گز کے فاصلے پر۔ لیکن پھر بھی اس کو ایزل کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے اس نزدیکی کا احساس نہ ہو سکتا تھا۔

میں ایزل کی آڑ سے اس کے سینے کی شفاف عریانی کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت وہ پوشیدہ خزانے جو صنفِ نازک کی دلربائی اور دلکشی کا بہت بڑا باعث ہیں۔ مجھے ایک مدھم جھلک دکھلا رہے تھے۔

لیکن میرے احساسِ خودداری کو اپنی اس حرکت سے شرم آئی میں نے ایک بہت ضخیم کتاب اٹھائی یہ یوفت سی گیلری کی تصویروں کی رنگین کیٹیلاگ تھی۔ اپنی اس غیر دلچسپ مصروفیت کے درمیان میری نگاہیں سرکشی کر کے اس کے نیم عریاں سینے تک پہنچ کے پھر واپس آجاتیں۔

ایک مرتبہ میری نگاہیں کتاب کے بیچ کر اس کی جانب متوجہ ہو رہی تھیں کہ راستے میں...... اس کی نگاہوں سے دوچار ہوئیں۔ اس خون کی حرارت اور تیزی کو اس کے تنفس کی تیزی کے باعث میں اتنی دور سے بھی محسوس کر سکتا تھا۔ مجھے احساس ہوا۔ کہ وہ برابر کنکھیوں سے میری نقل و حرکت دیکھ رہی ہے۔

اس کی نگاہیں کچھ شرم و حجاب کچھ جذبات کی سرخی سے جھک گئیں۔ میری نگاہیں پھر اس کے چہرے پر سے ہوتی ہوئی اس کے سینے کی عریاں جھلک تک پہنچ گئیں۔ اس کے بازو کی ایک جنبش نے اس کے سینے کے بائیں حصے کو بالکل عریاں کر دیا.....

سر سے پیر تک میرے جسم میں ایک جلا دینے والی لرزش طاری تھی۔ میرا چہرہ جذبات کی انتہا سے سرخ ہو کر سفید پڑ گیا تھا میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کا جسم بھی جل رہا ہے.... جذبات کی تیز و تند آگ میں جل رہا ہے.... ـــ

میں نے ایک شدید ترغیب محسوس کی کہ میں جھپٹ کر اس کو اپنے سینے سے لگالوں۔ اس کی ہستی کو اپنی ہستی میں فنا کر دوں...

دوسری فضا

لیکن دفعتاً ایک سرسراہٹ کے ساتھ سلیمہ دوبارہ داخل ہوئی۔ زلیخا نے فوراً دروازے کی طرف رخ کر دیا۔ اور ایک چشم زدن میں اس کا قمیص اس کی ساڑی کا آنچل سب اپنی جگہ پر تھے۔ سلیمہ کی بڑی بڑی متبسم اور حیران آنکھیں ٹک تک نہ کر سکیں۔

سلیمہ میری کرسی کے قریب آئی۔ اور کرسی کی پشت پر جھک کر کہنے لگی "نسیم جلد۔ کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ تمہیں ابا جان شاید کسی کام سے بلاتے ہیں۔ امی جان کے پاس ہی بیٹھے ہیں۔"

سلیمہ کا جسم میرے جسم سے لگ رہا تھا لیکن اگر مجھے کسی قسم کا احساس تھا تو صرف اس کا کہ ایک فرشتے کا جسم ایک انسانی جسم سے مس کر رہا ہے۔ مجھ پر جنسی اثر شمہ بھر نہ تھا۔

میں نے مسکرا کر جواب دیا "بہت اچھا"..... جذبات کے طوفان کے بعد اس ملکوتی ردِ عمل میں مجھے وہ کیفیت معلوم ہو رہی تھی۔ جو ایک طوفانی تھپیڑے کے بعد ہوا کے ایک لطیف اور خوشبودار جھونکے میں معلوم ہو سکتی ہے۔

میں اٹھا۔ سلیمہ کا چہرہ اس کی بڑی بڑی آنکھیں معصومیت کی زندہ داستان تھیں۔ کچھ کم سنی، کچھ طبیعت کی افتاد، کچھ ناتجربہ کاری، کچھ فطری معصومیت کی وجہ سے اس لڑکی میں یا اس لڑکی کے افعال میں جذباتِ جنسی کی خفیف سی جھلک بھی نہ تھی۔

ہوس

میری نگاہیں پھر زلیخا پر پڑیں۔ اس کا چہرہ زہر بلا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جو ہمیشہ جھکی رہتی تھیں، سخت جانگداز زہر صاف نمایاں تھا۔ اس کے چہرے کی حجاب آلود سرخی رخصت ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ شکست خوردہ نسائیت کی نخوت تھی اور انتقام کا سیاہ جذبہ مجھے تعجب معلوم ہونے لگا۔ کیا اقبی نیل کلیوپیٹرا کی نخوت بھی اس کے سامنے کچھ حقیقت رکھتی تھی۔

میں پہلی نظر میں سمجھ گیا سلیمہ کا مجھ سے اس قدر قریب آکر کھڑا ہونا سلیمہ کا جذبات کے اس انتہائی لمحے میں مُخل ہونا ــــ اس کا بس چلتا تو اسی وقت سلیمہ کا خون پی لیتی۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر اس کی جاں گداز نگاہیں دھمکی دے دے کر مجھ پر پڑ رہی تھیں، اس کا خیال تھا۔ کہ میں نے سلیمہ کو اس پر ترجیح دی ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اس کی طرح سلیمہ کو اپنی محبت کے لئے انتخاب کیا۔

اس کی آنکھوں میں شکست خوردہ نسوانی نخوت تھی۔ اس کے چہرے کے رنگ سے انتقام کی دھمکیاں ظاہر ہو رہی تھیں، وہ اپنے شکوک میں کامل تھی اپنے مفروضات پر قائم تھی۔

مجھے جمیل کے الفاظ یاد آگئے "تمہاری بھی باری آئے گی"

تو کیا اس طرح؟ ــــ کیا محبت، میرے لئے اس کی عداوت کا سامان بن گئی؟ میں نے ایک ناگن کو محبت کے لئے انتخاب کیا تھا۔

دوسری فضا

۷

موسم کسی قدر گرم تھا۔ برقی پنکھے کی ہوا۔ مجھے وہ تازگی عطا کرنے سے قاصر تھی۔ جس کا میں اس وقت طلبگار تھا۔ میں سمندر کی جانب کی کھڑکیوں کے پاس کھڑا تھا۔ کہ ہوا کی تازگی سے اپنے پست حواس کو تازہ دم کر سکوں۔

جمیل تیزی سے میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا "چلو تم کو ایک تماشہ دکھاؤں"

میں نے ذرا حیران ہو کر کہا "کیوں"

اس نے ایک سنجیدہ تبسم کے ساتھ کہا "چلو تو سہی"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا مجھے لے چلا۔ میں نے اس کے برابر قدم رکھنے کی کوشش کی۔ میرا ایک ہاتھ اب تک اس کی گرفت میں تھا۔ وہ کریپ سول کا جوتا پہنے ہوئے تھا۔ اس کے چلنے سے کسی قسم کی آواز پیدا نہ ہوتی تھی۔

سلیمہ کے کمرے سے ہوتا ہوا وہ زلیخا کے کمرے کے دروازے کے پاس جا کر رکا۔ میرے کان میں آہستہ سے کہا "آہستہ آہستہ دبے پاؤں چلو" اور وہ زنانے ڈرائنگ روم کے دروازے کے قریب اسی طرح میرا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

میں زلیخا کی آواز کا ایک ایک حرف سن رہا تھا وہ شکایت کے زہریلے لہجے میں غالباً چچی صاحبہ سے کہہ رہی تھی "! ور نسیم کچھ کم نہیں ہیں۔ جمیل کے ساتھ وہ بھی برباد ہو رہے ہیں میں ان سے تصویر کھنچواؤں گی۔ وہ میری والی تصویر بن کھنچی پڑی ہے تو کوئی پرواہ نہیں"

چچی صاحبہ کی آواز یہ کہتی سنائی دی "تو پھر تم نے تصویر اتروانا کیوں شروع

کی تھی"

زلیخا کی آواز نے جواب دیا" ان کو خود ہی بڑا شوق ہے۔ تصویر بنانے کا۔ میری بلا کو کیا غرض"

پھر کچھ حرکت کی آواز معلوم ہوئی۔ میں اور جمیل اسی تیزی سے سلیمہ کے کمرے سے ہوتے ہوئے نکل گئے۔ اور میں جمیل کے کمرے میں ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ جمیل نے میرے قریب ایک کرسی گھسیٹ لی۔

جمیل کو مجھ پر خفیف ترین شک بھی نہ تھا۔ اس کا خیال یہی تھا۔ کہ زلیخا کی زہریلی فطرت اسے زبردستی میری شکایت پر مجبور کر رہی ہے۔

میں نے اپنے چہرے پر انتہائی معصومیت اور مظلومیت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ گویا زلیخا کے الفاظ کا میرے دل پر بہت تکلیف دہ اثر ہوا۔

حقیقت میں اثر تو دل پر بہت ہوا تھا۔ مگر اس قدر تکلیف دہ نہیں۔ میں اس کی نظروں سے اس کے آئندہ ارادوں کو اسی وقت پہچان گیا تھا جب اس نے بلا سبب سلیمہ کو اور مجھ کو اس قدر کڑوی نظروں سے دیکھا تھا۔

میں سوچنے لگا میری نسبت تو اس نے اتنا کہا تھا لیکن غریب سلیمہ کی خدا جانے اس نے کن بکروہ الفاظ میں کیا شکایت کی ہوگی۔ کیا گت بنائی ہوگی۔

میرا خیال غلط نہ نکلا۔ گھنٹہ بھر کے بعد جمیل سلیمہ کے کمرے کی طرف سے آیا اور کہنے لگا" سلیمہ زار و قطار رو رہی ہے۔ زلیخا نے اس کی بہت شکایت کی ہے"

دوسری فضا

میں نے کہا "کیا شکایت ہے؟" اور مجھے خوف معلوم ہونے لگا۔ کہ کہیں اس سلسلے میں میرا نام تو نہیں دیا۔"

اس نے غصے میں بھر کے جواب دیا "اس مردار نے سلیمہ کے متعلق وہ باتیں کہیں جو کوئی بہن اپنی بہن کی نسبت سن بھی نہیں سکتی۔ میرے سامنے اس نے سلیمہ کو بدچلن کہا بدنظر کہا اور خدا جانے کیا کیا کہا۔"

"تو کوئی قصہ بھی بیان کیا؟" میں نے دم روک کر اپنے کامل اطمینان کے لئے سوال کیا۔

"قصہ کیا بیان کرتی۔ آج تک اس نے اپنی شکایت کے ساتھ کوئی قصہ بیان کیا تھا اس کی شکایتوں کا نہ کبھی سر ہوتا ہے نہ پیر۔ بس اس نے صرف اتنا کہا تھا۔ کہ اماں جان یہ کمبخت بڑی بدچلن بڑی بدنظر ہے۔ اس کی نگرانی زیادہ کیجئے؟" اس کی زبان سے یہ الفاظ سن کر مجھے اتنا غصہ آیا۔ کہ جی چاہتا تھا۔ اس کی گردن مروڑ ڈالوں۔" جمیل غصے سے کانپ رہا تھا۔

میں نے اپنے دل میں شکر ادا کیا۔ ساتھ ہی مجھے خیال آیا۔ اس کو اس سلسلے میں میرا نام لینے کی جرأت بھی نہ ہو گی۔ وہ خود کمزوری کا ایک سے زیادہ موقعے پر اظہار کر چکی تھی۔ علانیہ حملے کی اس میں ہمت نہ ہو گی۔ اگر وہ شکایت بھی کرے گی تو بالکل دوسرے ذریعوں سے۔

مجھے یقین تھا۔ کہ چچا جان کو، چچی جان کو، جمیل کو میری معصومیت اور بے گناہی

بالکل اعتماد تھا۔ ان کے حاشیۂ خیال میں بھی میرے نسبت وہ خیالات نہ آ سکتے تھے جن کا مرتکب میں ہو چکا تھا۔

مجھے ایک لمحے کے لئے خود اپنے آپ پر تعجب ہونے لگا میں جو دیکھنے میں اس قدر معصوم صفت معلوم ہوتا تھا۔ کہ مجھے اپنی معصومیت کا یقین تھا ایک اس درجہ خطرناک معاشقے میں ملوث ہو رہا تھا۔

میں نے اپنے عکس کو بے اختیار اپنے سامنے کے آئینے میں دیکھ لیا۔ تو میں ہی تھا؟ اب بھی مجھے یقین نہ آتا تھا۔ کہ اس بھولی بھالی صورت نے جو مجھے آئینے میں نظر آ رہی تھی، اس خطرناک کام میں ہاتھ ڈالا ہوگا۔ اس سیاہ دلی اور شیطنت کو ــــ کم از کم دوسروں کے زاویۂ نظر سے سیاہ دلی اور شیطنت ــــ اختیار کیا ہوگا۔ خیال کرنے کا مقام ہے کہ میں نے ــــ میں نے حقیقت میں اس سے محبت شروع کی۔

میں اپنے عکس کو دیکھ رہا تھا۔ اور اپنے خیالات میں اس قدر محو تھا۔ کہ میں جمیل کی موجودگی کو محسوس نہ کر سکا۔ جمیل اسی غصے کے انداز میں باہر چلا گیا۔ اور اب پھر ٹھنڈے دل سے ٹھنڈے چہرے سے وہ میرے قریب کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"آج آئینے کی بری طرح تلاوت ہو رہی ہے"

"میں شرمندہ ہو کر چونک پڑا لیکن اس کے دوسرے جملے نے میری خود پسندی کو اور زیادہ جھکا دیا۔

"اور تمہارا آئینہ دیکھنا زیبا بھی ہے" پھر کسی قدر حسرت کے لہجے میں کہنے لگا "اگر تمہارے جیسا چہرہ میرا بھی ہوتا تو ایک مہینے کے اندر زبوبر کالج کی ساری لڑکیاں مجھ پر مرنے لگتیں۔"

پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ کہنے لگا "ایک تم ہو اپنی صورت سے کام لینا نہیں جانتے" میں ہنس رہا تھا۔ گویا جمیل کوئی بہت خوش آئیند جھوٹ بول رہا ہے۔ مگر میرے دل میں اس کا خاصا دیرپا اثر ہو چکا تھا۔

انسانی جذبۂ خود پسندی ایک سمند ناز ہے، جو صرف ایک تازیانے کا بہانہ ڈھونڈھتا رہتا ہے۔

میری خود پسندی کو معاف کیجئے گا۔ مگر میں یہی کہوں گا — کہ اب میری سمجھ میں آگیا، کہ کیوں اس قدر جلد محبت کی نگاہوں کا جواب زلیخا نے بھی کسی قدر التفات سے دیا۔

اور اس سے بھی زیادہ واضح طور پر اب میں یہ سمجھ سکا، کہ اسے سلیمہ سے یہ غیر معمولی رشک کیوں ہوا؟

میں اب تک تصویر کے اس رخ کو نظر انداز کئے ہوئے تھا۔

۸

کئی دن تک حالات اسی مقام پر رہے۔ میں نے زاہنی زلیخا کی نفسی کیفیت

میں کوئی خاص تبدیلی محسوس کی۔

وہ اکثر سلیمہ کی، اور کبھی کبھی میری شکایت، چچاجان اور چچی جان سے کیا کرتی چچا جان صرف سن کر خاموش ہوجاتے۔ میری نسبت ان کے خیالات اتنے اچھے تھے۔ کہ اُن پہ ان شکایتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

چچی جان البتہ بعض اوقات میرے خلاف ایک آدھ جملہ کہہ جاتیں۔ میرے سامنے انہوں نے کبھی ایک لفظ بھی نہیں کیا۔

ان تمام قصّوں کو سلیمہ جمیل سے بیان کرتی اور جمیل مجھ سے۔

خود مجھ میں ایک بیزاری سی محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کے سوا ان دنوں میری فنی مصروفیتیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ میں بھی نمائش کے لئے ایک تصویر تیار کر رہا تھا۔ اس انہماک میں میری توجّہ صرف کبھی کبھی زلیخا، اور اس جذبۂ عشق کی طرف متوجّہ ہو جاتی۔

۹

یہ میری انتہائی مصروفیت کا زمانہ تھا لیکن جذبۂ محبّت کے بھی شاید دورے ہوتے ہیں۔ ایک صبح کو میں چچی کے پاس بیٹھا وقت سے پہلے چائے پی رہا تھا۔ مجھے کہیں جانا تھا۔ چچی آج ادھر ادھر کی بہت سی باتیں پوچھ رہی تھیں۔ نئی نئی ایجادوں کے قصّے دریافت کر رہی تھیں۔

سامنے سے میں نے زلیخا کو آتے دیکھا۔ وہ ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی۔ ایک بے سنگی

دوسری فضا

اس کی صورت کی طرح، اس کی چال، اس کے بالوں، اسکے کپڑوں میں بُی جاتی تھی میری طبیعت کے جمال پرست عنصر نے مجھ سے سوال کیا: تو تم کو اسی سے محبت ہے؟"

بلا کسی پس وپیش کے طبیعت کے جذباتی رجحان نے جواب دیا: بیشک"

دس بجے کے قریب میں واپس آیا۔ اندرونی ڈرائنگ روم میں مجھے زلیخا ملی۔ اس کے بال آراستہ تھے۔ اس کے چہرے پر غازے کی موٹی تہ جمی ہوئی تھی۔ اس کے لباس کی آراستگی اس کے جسم کی بدوضعی کو بالکل چھپائے ہوئے تھی۔ وہ ایک قابل محبت چیز معلوم ہو رہی تھی۔

میں وہیں بیٹھ گیا۔ جمیل بھی آگیا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ زلیخا کچھ رُکے ہوئے لہجے میں اور کبھی اپنے خاص ساختہ بے ساختہ پن کے ساتھ مجھ سے بھی کچھ پوچھتی یا کوئی بات کرنے لگتی۔

اور وہ آگ جو عارضی طور پر دب گئی تھی، میرے قلب میں پھر سلگنے لگی۔ میں اس آگ کی بڑھتی ہوئی گرمی کو بہت لطف و اطمینان سے محسوس کر رہا تھا۔ آغاز الفت کی بے چینیاں، ناتجربہ کاریاں رخصت ہو چکی تھیں۔

میں نے ایک ترغیب کو اپنے دل پر قابو پاتے دیکھا۔ مجھے ایک اور قدم آگے بڑھنے کی ضرورت تھی۔ اور سوال یہ تھا۔ کہ ایک اور قدم کس طرح بڑھایا جائے۔ ایک مرتبہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اس کو فتح کرنے کی کوشش کی تھی وقتی طور پر میں اس

میں ناکام رہا تھا۔ اب یہ راستہ میں استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ راستہ مجھے غلط اور غیر محفوظ معلوم ہو رہا تھا۔

تو کیا میں زبانی اس سے اظہارِ محبت کروں؟ — میں اپنے آپ میں اتنی جرأت نہ پاتا تھا۔ اتنی دماغی نشوونما کے باوجود میں اپنی طفلانہ کمزوریوں پر غالب نہ آسکتا تھا۔ مجھے یقین تھا۔ کہ میں کچھ بھی نہ کہہ سکوں گا۔

تو کیا میں خط کے ذریعے اظہارِ محبت کروں؟ یہ سب سے زیادہ خطرناک راستہ تھا میرا خط اس کے پاس پہنچنے سے پہلے، یا اس کے پاس پہنچنے کے بعد، کسی دوسرے کے ہاتھ لگ جائے تو رسوائی، تباہی اور خدا جانے کس کس خرابی کا سامان ہو جائے

اس کے علاوہ مجھے شک تھا میں اس کے جذبات کو یقینی طور پر عقلی طور پر اپنے موافق قرار نہیں دے سکتا تھا ممکن ہے کہ یہ صرف میرا خیال ہو جذبات نے شباب کی خود پسندی کے ساتھ صرف مجھے دھوکا دیا ہو۔ ممکن ہے۔ کہ وہ میرے طرزِ عمل کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی ہو ممکن ہے اس کا برائے نام التفات، صرف میری نظروں میں التفات معلوم ہوتا ہو، اور اگر فی الحقیقت التفات ہو بھی تو پوشیدہ برائے نام اور آن کی آن میں گزر نے اور فنا ہو جانے والا سطحی اور بالکل سطحی التفات ہو۔ اس صورتِ حال میں میں کیونکر اس کے نام اس قدر دیدہ دلیری سے نامۂ محبت لکھ سکتا تھا۔ اس کی زہریلی طبیعت سے کچھ بعید نہ تھا۔ کہ وہ اپنا بچاؤ سوچ کر میرا خط اپنے والد یا اپنی والدہ کو دیدے، اور الٹے لینے کے دینے پڑ جائیں۔

میں کوئی ایسا ذریعہ سوچ رہا تھا۔ کہ اس کو اور صرف اس کو میرا مافی الضمیر معلوم ہو سکے۔ اور مجھے اس کا اطمینان ہو جائے کہ میرا پیغام صرف اسی کے ہاتھوں تک پہنچا ہے۔ اور پھر وہ اپنا بچاؤ سوچ کر مجھے پھانسنے کی کوئی تدبیر کر سکے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں نے محبت کے لئے ایک ناگن کو انتخاب کیا تھا —— میرا کھیل زندگی اور موت کا کھیل تھا۔ ۔ ۔ اور حفاظت میرا فرض تھا۔

بالآخر میں نے ایک تدبیر سوچ لی۔

کاغذ کے ایک ٹکڑے پر میں نے لکھا، رسم الخط کو کچھ بدل کر۔

"ز" سے

"مجھے تم سے محبت ہے۔"

نیچے میں نے نام تک نہ لکھا۔ مجھے یقین تھا۔ کہ وہ فوراً سمجھ جائے گی۔ کہ اس سطر کا لکھنے والا میرے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اب مجھے صرف ایک یقینی ذریعہ تلاش کرنا تھا کہ یہ خط اس تک پہنچ جائے۔ میں اس کی کتابوں میں سے ایک کتاب پڑھنے کے لئے لایا تھا۔ میں نے اس کی بہت تعریف کی تھی۔ اس نے خود ابھی تک وہ کتاب پڑھی نہ تھی اور میری تعریف پر کہا تھا۔ کہ میرے ختم کر لینے کے بعد وہ خود پڑھے گی۔ میں نے اس چھوٹے کاغذ کو اسی کتاب میں رکھ دیا۔ اور وہ کتاب اسے واپس کر دی۔ خود اس کے ہاتھ میں دے دی۔ دوسرے دن میں نے کسی بہانے سے جا کر اس کے میز پر اس کتاب کی ورق گردانی کی وہ چھوٹی اس میں سے غائب تھی۔ کتاب میں نے اسے اتنے کھ اس وقت دی

تھی جب وہ باتوں سے تھک کر سونے کے لئے جانے لگی۔ سوتے وقت یقیناً اس نے اس کتاب کو کھول کر دیکھا ہوگا۔ اور چٹھی بھی۔۔۔۔

کم سے کم مجھے اس کا یقین تھا۔ کہ وہ چٹھی اس کی نظروں سے گزر چکی ہے! وہ اس کے قبضے میں ہے۔ لیکن اس وقت تک اس کی کسی حرکت، کسی بات میں بھی کوئی خلافِ معمول حجاب، کوئی مخصوصیت، کوئی مدافعانہ نخوت نہ پا سکا تھا۔

اس کے بعد میں نے اور زیادہ غور سے مشاہدہ شروع کیا۔ اس کے کسی فعل سے کسی خلافِ معمول بات کا اظہار نہ ہوتا تھا۔

آخر اس غیر معمولی خاموشی اس فرضی بے توجہی کا باعث کیا تھا۔

کیا یہ خاموشی، اس کی رضا، اس کے خاموش جواب کی نشانی تھی۔

یا حجاب اس کے لئے زنجیرِ پا ثابت ہو رہا تھا ؟

اگر اس نے میرے اظہارِ محبت کو قبولیت کی نظروں سے دیکھا۔ تو پھر جواب کیوں نہیں دیا ؟ اس کی وجہ یہ ہو سکتی تھی۔ کہ میرا نامۂ محبت بہت زیادہ مبہم تھا۔ خطاب میں اس کے نام کی جگہ صرف اس کے نام کا پہلا حرف تھا۔ اور اپنا تو میں نے نام بھی نہ لکھا۔ اسے شک بھی پیدا ہو سکتا تھا۔ کتنا ہی خفیف سا شک کیوں نہ ہو۔ مگر وہ جواب نہ دینے کی وجہ بن جانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

لیکن مجھے حقیقت کا بھی احساس ہوتا جا رہا تھا۔ صرف ایک ناکتخدا پردہ نشین لڑکی ہونے کی وجہ سے وہ باوجود عملی صلاحیتوں کے بالکل پریشان تھی۔ اس کا ابتدائی

التفات، ممکن ہے کہ اس کی نظروں میں صرف جذبات کا ایک پوشیدہ طفلانہ کھیل ہو۔ وہ مجھے زیادہ گستاخیوں کی اجازت نہیں دے سکتی تھی، نہیں دینا چاہتی تھی۔

خود پسندی، اور جذبات کے ایک بے گناہ طفلانہ کھیل سے آگے وہ بڑھنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر وہ حیران تھی۔ کہ کس طرح مجھے روکے ممکن ہے اس چھٹی نے اس کی خود پسندی کو یا اس کی نسوانیت کو کسی قدر جگا دیا ہو۔ مگر اس کا یقین کیونکر ہو سکتا تھا کہ وہ میری طرح بالکل اپنے جذبات کی مطیع ہو چکی ہے۔

مگر شباب، شباب کی خود پسندی کے نزدیک ان عقلی دلائل کی کیا اہمیت!

بہرحال کئی دن گزر گئے۔ اس کی خاموشی میں سرمو فرق نہ آیا۔ اس کے رویّے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ سب کے سامنے اور تنہائی میں اسی طرح باتیں کرتی گویا کوئی بات پیش نہ آئی تھی۔

میں واقعات کی اس یکساں روانی سے اکتا گیا تھا۔

۱۰

اس کے بعد میں غور کرتا رہا۔ کہ اس جمود کو پھر کسی طرح توڑ دوں۔ کیوں نہیں کبھی موقع پا کر تنہائی میں اس سے صفائی کے ساتھ اپنے پورے شاعرانہ استعارے استعمال کر کے محبت کا اظہار کروں۔

یہ خیال میرے دل میں پختہ ہو گیا۔ ایک دن میں نے طے کر لیا کہ میں آج اُسے

سوس

اپنی محبت کی داستان سناؤں گا۔

اتفاق سے ایک موقع بھی مل گیا۔ وہ ڈرائنگ کے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں شریک ہورہی تھی امتحان کی تیاری کے سلسلے میں اسے مدد کی ضرورت تھی اس نے مجھ سے کہا "اگر تم کو فرصت ہو تو مجھے تیاری میں مدد دینا۔"

میں نے بہت گرمجوشی سے مدد دینے کا وعدہ کیا۔ اس جمود کے ساتھ ساتھ اس غیر معمولی قلبی تعلق کے باوجود میں روزمرہ کی زندگی میں اس سے ایک بعد محسوس کرنے لگا تھا۔ خود اپنے الفاظ اس وقت مجھے بہت زیادہ مصنوعی معلوم ہوتے۔

بہرکیف، سہ پہر کو ڈرائنگ کی مشق کرنے وقت جب وہ بیٹھی۔ تو اس طرح کہ میز اس کے اور میرے درمیان میں تھی۔ اگر عمداً میرا پیر اس کے پیر سے ٹکرا جاتا۔ تو وہ اسے اپنی طرف کھینچ لیتی۔ وہ اس کی بہت احتیاط کر رہی تھی۔ کہ میری انگلیاں اس کی انگلیوں سے مس بھی نہ کرنے پائیں۔

ایک مقیّد، پردہ نشین لڑکی اپنی نسوانیت کو اس سے زیادہ کیا دبا سکتی۔ وہ مجبور تھی۔ غیر ارادی طور پر ایک لرزش کبھی کبھی اس کے جسم پر طاری ہو جاتی کبھی جب وہ میری طرف دیکھتی۔ تو جذبات اس کے چہرے کے رنگ کو دگرگوں کر دیتے اور اس کے رنگ کی تبدیلی کے ساتھ میرے چہرے کا رنگ بھی بدلنے لگتا۔ تو وہ بے پروائی کی ایک کوشش کے ساتھ کام میں منہمک ہو جاتی۔

وہ میز پر جھک کر ڈرائنگ کی مشق کر رہی تھی۔ میرے سر سے اس کا سر بمشکل

دو انچ کے فاصلے پر ہوگا۔ میں نے اپنے سر کو دائیں طرف ہٹایا۔ میرا منہ اس کے رخسار سے اس قدر قریب تھا کہ غالباً وہ میرے سانس کی ہوا کو بھی محسوس کر رہی ہوگی۔ اس نے جذبات کی کشمکش کے ساتھ ایک اضطراب میں اپنے سر کو پیچھے کی طرف ہٹالیا۔ شاید ایک پردہ نشین لڑکی کے عشق کے خوفناک نتائج اس کی نظروں میں گھوم رہے تھے

اس کے رخسار میں تازگی اور شگفتگی نہ تھی۔ مکمل عورت بن چکنے کے بعد، وہ طفلانہ زندگی جو کم سن لڑکیوں میں شباب کی آمد کے ساتھ ساتھ پائی جاتی ہے۔ فنا ہونے لگتی ہے۔ اس کے سفید رخسار مجھے گوشت کے نہیں، ایک لمحہ کے لئے مرمر کے معلوم ہونے لگے۔

وہ پھر جھک کر مشق کر رہی تھی۔ میں نے اپنے سر کو پیچھے ہٹالیا تھا میں اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ میں اپنی نگاہوں میں محبّت کے شرر پیدا کرنا چاہتا تھا میں بیتاب تھا۔ کہ میری نظروں میں کوئی مسحور کرنے والی قوت پیدا ہو۔ اور اس کی تاب مقاومت کو ہمیشہ کے لئے ختم کردے۔

ڈرائنگ کی مشقوں کی طرف، میری توجہ کا ہونا تو بھی نہ پہنچا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اسے بھی اچھی طرح معلوم ہے۔ کہ میں مشقوں کی طرف مطلق توجّہ نہیں دے رہا۔ پھر اس نے مجھے اپنی ہدایت کے لئے کیوں بلایا تھا۔ کیوں برابر بلا رہی تھی۔ اگر وہ آگ سے بچنا چاہتی تھی۔ تو آگ سے کھیل کیوں رہی تھی۔

آہ انسانی جذبات کس قدر متضاد ہیں۔ انسانی سرشت اجتماع ضدّین ہے

وہی آگ جس سے وہ بچنا چاہتی تھی۔ اس کے لئے ایک طلب ایک تجسّس کا باعث تھی وہ اس سے دور بھی بھاگنے کی کوشش کرتی تھی۔ اور نزدیک بھی رہنا چاہتی تھی۔

میں یہ سب محسوس کر رہا تھا۔ اس نے جو تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ تعلیم جس نے پردے کی اس خوفناک قید کو اس کے لئے اور زیادہ ناقابلِ برداشت بنا دیا تھا میں اسی تعلیم کی مدد سے اس کو اس شش و پنج سے نکال کر اس کے انجام سے بالکل آنکھیں بند کر کے صرف اپنے نقطۂ نظر سے اسے ان حدود تک پہنچا دینا چاہتا تھا جس حد تک پہنچنے کی نسوانیت ہمیشہ آرزومند اور متمنّی رہتی ہے۔ وہ حدود کتنے ہی خطرناک سہی۔ مگر میری خودغرضی، میری مستقل مزاجی رہبر تھی۔

پردے نے عام لڑکیوں کی طرح اس کے احساسات کو — جو عام لڑکیوں کے احساسات سے اس کی نخوت اور نسوانی خودپسندی کی وجہ سے بہت زیادہ تیز تھے۔ بہت نازک، بہت تیز بنا دیا تھا وہ عام پردہ نشین لڑکیوں کی طرح مرد سے ناواقف تھی۔ مرد اس کے لئے، اس کی تمنّاؤں کے لئے اس کی چھپی ہوئی آرزوؤں کے لئے ایک معمّہ تھا اگر پردہ نہ ہوتا تو یہ خطرناک اجنبیّت اور یہ تباہ کن ترغیب نہ ہوتی پردے نے خود اس تباہی کا سامان کر دیا۔ جس سے بچانے کے لئے پردے کا اہتمام کیا گیا تھا۔

میں یہ ارادہ کر کے آیا تھا۔ کہ اس سے اظہارِ محبّت کر دوں گا۔ مگر اتنی جرأت پیدا نہ ہو سکی۔ میری خودغرضی نے بہت اکسایا، بہت ترغیب دلائی لیکن الفاظ میری

۔ دوسری فضا

زبان تک آ آ کے رک گئے۔ یہی گوناگوں خیالات اس کی اور ہندوستانی پردہ نشین لڑکیوں کی مظلومیت، ان کی بے بسی، ان کی بے گناہ گناہگاری، اور یہ سب امور میرے ذہن میں چکر لگاتے رہے۔

میں نے اپنے دل میں کہا: "اب آج جانے بھی دو۔ کل دیکھا جائیگا"

اور خدا جانے ایسے کتنے کل گذر گئے۔

اس روز میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اور اس پورے قصّے کو اپنے نہیں، بلکہ ایک غیر جانبدار تماشائی کے نقطۂ نظر سے جانچنے لگا۔ ایک چوٹی کے مسلمان خاندان کی تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ جس نے اپنی معاشرت کو دیکھتے ہوئے بہت کافی تعلیم پائی تھی۔ جو ایک حکومت کرنے والا دماغ، نخوت پسند دل، اور جنسی جذبات سے معمور دل رکھتی تھی۔ اپنے ذہنی نشو و نما کے بعد اپنی آرزوں کے معیار تک پہنچنے کی بہت زیادہ طلبگار تھی۔ اس کو دامِ بلا میں پھنسانے والی چیز ناتجربہ کاری اور سادگی تھی۔ اگر وہ بے پردہ ہو کر مردوں سے مانوس رہتی تو بہت ممکن تھا۔ کہ نسوانی اداؤں سے بڑھنے کی نوبت نہ پہنچتی۔ جنسی ترغیب اسے کبھی دامِ تزویر میں گرفتار نہ کر سکتی۔ اور اپنے خود پسند، نخوت پسند دماغ سے وہ اپنے لئے بہترین شوہر انتخاب کرتی۔

عام پردہ نشین لڑکیوں کا تو ذکر کیا جن کو کسی مرد کا ایک جھوٹا وعدہ، ایک دلفریب لفظ برانگیختہ کر کے بالکل تباہ کر سکتا تھا۔ زلیخا ایسی لڑکی تھی جو اپنے آپ پر کیا، دوسروں پر حکومت کرنے کی اہلیت رکھتی تھی وہ تعلیم کی وجہ سے زندگی کے نشیب و فراز

سے واقف تھی۔ پھر بھی وہ مجبور تھی۔

چچا جان، طرزِ رہائش اور لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم میں انتہائی روشن خیالی کے باوجود پرانے خیال کے آدمی تھے۔ کاش وہ بمبئی آنے کے بعد، یہاں کے اکثر مسلمان خاندانوں کی طرح پردے کو خیرباد کہہ دیتے۔ تو کم سے کم پسِ پردہ یہ خرابیاں تو پیش نہ آتیں۔

کھلّم کھلّا برائیوں سے زیادہ ہولناک وہ برائیاں ہیں، جو پسِ پردہ ظہور میں آتی رہیں۔ اور دنیا ان کو نیکیاں سمجھتی رہے۔

زلیخا نے پھر بھی اس قدر کشمکش، اس قدر مقابلہ کیا تھا۔ اگر سلیمہ اس کی جگہ ہوتی تو اس کی معصومیت سب سے پہلے اسے گرفتار کرانے کا باعث بنتی۔ زلیخا کی زہریلی طبیعت پھر بھی اس کی محافظ تھی۔ سلیمہ کی ملکوتی صفتیں اس کی دائمی تباہی کا باعث بن جاتیں۔

غیر جانبدار تماشائی سے تحلیل ہو کر میں پھر نسیم ہو گیا۔ میں خطرناک نتائج کو اس وقت بھی محسوس کر رہا تھا۔ اب بھی موقعہ تھا۔ مگر پھر میری خود غرضی مجھ پر غالب آنے لگی۔ اور ہوس....

یہ آگ کا کھیل جس سے ایک خاندان کی عزت و آبرو، افرادِ خاندان کی زندگی خطرے میں تھی۔

وقتی طور پر میں نے ایک اطمینان کی حالت محسوس کی کہ آج میں نے اس سے

اظہار محبت نہیں کیا۔ اور میں نے اس ہوس کے کھیل کو ختم کر دینے کا ارادہ کر لیا۔

۱۱

مگر میرا ارادہ دوسرے دن زلیخا کی صورت دیکھ کر درہم برہم ہوگیا۔ ہوس سینے میں چھپ چھپ کر تصویریں بنا رہی تھی۔

میں محسوس کر رہا تھا شباب کے اندھے جذبے نے مجھے ایک گرداب میں ڈال دیا تھا۔ یہ ہوس کا گرداب تھا۔ میری عقل مجھے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرا نیم جان ضمیر میری مدد کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر گرداب کا خوفناک چکر۔۔۔

اور یہ چکر میرے لئے تو خوفناک تھا ہی، مگر میں ایک اور ہستی کو ایک اپنے سے زیادہ کمزور بے بس ہستی کو اپنے ساتھ اس گرداب میں کھینچ رہا تھا۔

میرا بچ جانا ممکن تھا لیکن اس غریب لڑکی کا کیا حشر ہوگا۔

ایک ثانیے کے بعد شادی کا خیال میرے ذہن میں پیدا ہوا۔ شادی تو کیا میں اپنی ہوس کے خمیازے میں اپنی زندگی بھی برباد کر لوں گا۔ اب مظلوم، بے بس زلیخا کی جگہ مجھے زہریلی خطرناک زلیخا بھی نظر آنے لگی۔ میری زندگی، ہوا اپنی شرکت کے لئے نسوانی جمال کے کامل ترین نمونے کی طلبگار تھی ہمیشہ کے لئے تباہ ہو جائے۔

لیکن انصاف سے دیکھا جائے تو میری ہوس کا کم سے کم خمیازہ تھا۔

تھوڑی دیر تک میرا دماغ بالکل ساکن رہا۔ ایک مصور کے خاموش، نقادانہ نقطہ

نگاہ سے میں نے پھر زلیخا کے ان تمام اثرات کا تجزیہ کرنا شروع کیا جو اب تک میں نے محسوس کئے تھے۔ اور ان احساسات سے ایک کے بجائے تین زلیخاؤں کے چہرے میرے خواب آلود تصور کو نظر آئے۔

ان میں سے پہلی زلیخا میرے چچا کی لڑکی تھی جس کی تباہی میرے چچا کی تباہی خاندان کی رسوائی تھی۔ میرے لئے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھنا باعث شرم تھا۔ اس کی رنج و راحت، میری رنج و راحت تھی۔

دوسری زلیخا، ایک افعی طبیعت سہتی تھی، میری طبیعت کا بے خوف خطرے سے کھیلنے والا پہلو اس سے ایک حریفانہ دلچسپی محسوس کرتا تھا۔ میں اس کا شاعرانہ نقطہ نظر سے کبھی کلیوپیٹرا، اور کبھی لیڈی میک بیتھ سے مقابلہ کرتا رہتا تھا۔ میں نے اسے محض اس کی زہریلی طبیعت کی وجہ سے معاشقے کے لئے انتخاب کیا تھا۔ مجھے یہ اس آگ کے کھیل کا سب سے زیادہ دلفریب حصہ معلوم ہوتا تھا۔ اگر اس میں یہ زہریلی کشش نہ ہوتی، تو غالباً میں اس کی طرف اس قدر زیادہ متوجہ نہ ہوتا۔

تیسری زلیخا صرف ایک عورت تھی میرا شباب ایک عرصے سے کا طلبگار تھا میرے شباب نے آنکھیں بند کر کے اپنے محدود دائرے میں اسے انتخاب کیا تھا۔ اس میں نسوانی حسن کا پتہ بھی نہ تھا۔ اس کی حیثیت دوسری زلیخا کی مرہون منت تھی۔

ان میں سے کوئی زلیخا شادی کے لئے ذرا بھی موزوں نہیں تھی۔

لیکن اس تجزیے کے بعد مجھے شادی کا تو خیال بھی نہیں آیا۔ میں نے اس خوفناک

دوسری فضا

حقیقت کو بری طرح محسوس کیا۔ کہ وہ تینوں زلیخائیں الگ الگ نہیں۔ وہ ایک ہی ہیں۔ ایک ہی ہستی کے تین مختلف پہلو ہیں۔

یہ تینوں شکلیں مجھے ہوس کے گرداب میں فنا ہوتی نظر آنے لگیں۔ اور ان کی جگہ صرف ایک زلیخا کا چہرہ نظر آرہا تھا۔

انسانی زندگی اضداد کا کیسا عجیب و غریب مجموعہ ہے

میں نے اور زیادہ غور کیا۔ تو میری سمجھ میں آیا۔ ایک فرد، ایک انسان، ایک جذبات کا پتلا ہونے کی وجہ سے میں اس ہوس میں حق بجانب تھا میری انفرادیت میری ہوس کا باعث تھی۔

لیکن ایک قوم، ایک جماعت کا رکن، ایک حصہ ہونے کی حیثیت سے مجھے زلیخا بے بس معلوم ہوتی تھی۔ اس سے میں ایک زیادہ وسیع ہمدردی محسوس کرتا تھا۔ اور اپنے آپ کو انتہائی بدنفس و خودغرض قرار دیتا تھا۔

ایک جمعیت، ایک کل جمعیت" کسی فرد کی ذاتی حیثیت کو کوئی اہمیت نہیں دے سکتی۔ اس نقطۂ نظر سے معاشرتی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے میں یقیناً مورد الزام تھا۔

مگر یہ سوال میرے دل میں بار بار بغاوت کر رہا تھا کہ کسی فرد سے یہ توقع کیونکر کی جا سکتی ہے۔ کہ وہ اپنی انفرادیت کو "کل" کی خاطر فنا کر دے۔

اس لحاظ سے میں حق بجانب تھا۔

۱۲

یہ عقلی تجزیہ، میرے ذہن سے بالکل محو ہوگیا پھر میرا قلب ایک مبہم، ناقابل بیان اضطراب محسوس کرتا تھا میں کچھ چاہتا تھا، کسی چیز کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کسی چیز سے بچنا چاہتا تھا۔

اسی قلبی ادھیڑبن سے پھر زلیخا کے نسوانی تصور نے نجات دلائی۔ آتش شوق کی گرمی جو کچھ لمحوں کے لئے سرد ہو جاتی۔ پھر بھڑکنے لگتی۔ اب پھر پوری سوزش سے میرے قلب کو جلانے لگی۔

اس کی تمام تر دوسری باتیں میرے ذہن سے محو ہو گئیں۔ اس کی ہستی، اس کی طبیعت تمام دوسری باتیں، ساری معاشرتی مصلحتیں، سارے اخلاقی قیود، میری نظروں سے فنا ہونے لگے۔ ہوس، سرخ دہکتے ہوئے دوہے کی طرح میرے قلب کو جلا رہی تھی۔ جو کچھ ہونا ہے ہو جائے۔ میں نتائج سے بالکل آنکھیں بند کر لینا چاہتا تھا "عشرتِ امروز" کی فکر کرنی چاہیئے "فکرِ فردا" سے کیوں اپنے آپ کو پریشان کیا جائے۔ میں ہر طرح ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔

میرے قلب کی سختی نے مجھے اس کمزوری پر ملامت کی۔ جو "ضمیر" کہلاتی ہے ضمیر — ایک نقصان رساں کمزوری جس کے استعمال کا بیسویں صدی میں کوئی موقعہ نہ تھا۔ ہر بت صنم پرستی کا سخت اور عملی عنصر، میری جمال پرستی کے نرم اور خیالی عنصر پر غالب آ رہا تھا۔

دوسری فضا

جب میں آنبدا کرچکا تھا۔ تو مجھے نتائج کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ اس لڑکی کے جذبات، صرف میرے گزرتے ہوئے طفلانہ احساس کے بازیچہ گاہ نہ تھے وہ بھی انسان تھی اس میں احساس اور قبولیت کی صلاحیت تھی۔ اس میں نسوانی جذبات تھے

یہ کھیل، محض ایک کھیل نہ تھا۔ یہ ایک خوفناک حقیقت تھی جب مجھے خود بخود اس اہم حقیقت کا احساس ہوا۔ تو میں نے اس کو کھیل سمجھ کر ترک کر دینا چاہا۔ مگر میرے بس کی بات نہ تھی۔ اب میں خود اس اہم اور خوفناک حقیقت کا ایک کھلونا بن چکا تھا۔ محبت کو میرے جذبات نے ایک آلۂ تفریح سمجھ کر انتخاب کیا۔ اب تک میں حقیقی معنوں میں محبت میں گرفتار نہ تھا..... لیکن مجھے محبت کی نہ چھوٹنے والی لت پڑ چکی تھی۔ میرا قلب اس سے نزدیکی ڈھونڈ رہا تھا...... میرے جذبات بے چین ہو ہو کر زلیخا کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔

میں نے ضمیر کے رہے سہے احساس کو بالکل محو کر دینے کی کوشش کی میں دل سے نہیں، دماغ سے محبت کر رہا تھا۔ میں نے اب اس کا تہیہ کر لیا تھا۔ کہ میں بے عقلی سے اپنے آپ کو محبت کے حوالے نہ کروں گا۔ میں محبت کے احکام کی تعمیل کروں گا لیکن ذاتی حفاظت کے ساتھ۔

میں نے سوچ سمجھ کر یہ طے کر لیا کہ میں محبت کا یہ پہلا تجربہ کروں گا۔ ضرور کروں گا۔ اور پوری خود غرضی کے ساتھ کروں گا۔

اس کے بعد میں کوئی اور بالکل نیا ذریعہ سوچنے لگا۔ کہ اس کے نسوانی حجاب

اس کی سربلند نخوت کو شکست دے کر اپنے اس خطرناک تجربے کو پورا کروں۔ میری خود غرضی کی حمایت صرف ایک خیال کرتا تھا۔ کہ میں نے اپنے خطرناک تجربے کے لئے، ایک خطرناک زہریلی عورت کو انتخاب کیا تھا جس کی تباہی، انسانیت پر بہت بڑا ظلم نہ ہو گی۔

۱۳

میں اپنے اسٹوڈیو میں داخل ہوا۔ میرا ایزل، میری ناتمام تصویریں، میرا فن سب مجھے ملامت کر رہا تھا کہ ایک عورت کی تلاش میں، میں نے ذاتِ حسن سے اس قدر لاپرواہی اختیار کی۔

مگر بے توجہی سے میں اسی طرح بیٹھا رہا۔ کاہل ارادے کے ساتھ۔

میں حسن کا پرستار تھا۔ مگر جذبات کی خواہش، حسن کی پرستش پر غالب آگئی تھی میری انسانیت، میری جمال پرستی پر حاوی تھی۔

میں اس کو حاصل کر لوں۔ جذبات کی خواہش پوری ہو جائے۔ تو پھر حسن کی پرستش کو میں جذبات کی اسفل سرحدوں سے بہت بلند کر سکوں گا۔ یہ خواہش، بشری خواہش اس پرستشِ جمال کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا سکتی تھی، وہ صرف ایک خواہش نہ بدمست خواہش تھی اور بس۔

پھر میری توجہ تصویروں سے ہٹ کر زلیخا کی طرف متوجہ ہو گئی۔ میں اس کو اپنے

دوسری فضا

آپ سے بہت قریب محسوس کر رہا تھا۔ گرمیاں میں ایک ہاتھ بڑھا کر اس کو حاصل کر لوں گا۔

۱۴

میں ایک کوچ پر لیٹے لیٹے سو گیا۔ دن کا وقت تھا۔ گرمی اچھی خاصی تھی سمندر کی طرف سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کھڑکیوں میں سے ہو ہو کر آ رہے تھے۔

کچھ دیر گہری نیند کے بعد نیم بیداری و نیم خواب کا ایک عالم طاری رہا اور اس حالت میں روشنی و تاریکی کی تبدیلی کے ساتھ زلیخا کی شکل بار بار مٹتی اور پھر نمایاں ہوتی نظر آتی۔

احساس کی بیداری بڑھتی گئی۔ غنودگی کے اثر نے نیم بیداری کے لمحوں میں حواس کو تیز تر کر دیا۔ اور زلیخا تک پہنچنے کی مختلف ترکیبیں اڑتے ہوئے طائروں کی طرح میرے سر کے پاس منڈلانے لگیں۔

رفتہ رفتہ خواب آلود غنودگی سست بیداری میں تبدیل ہو گئی۔ زلیخا کا خیال نمود گاہ کے بجائے دماغ میں ایک مستقل شکل قائم کر کے ساکت ہو گیا۔

پھر نیند کا ایک جھونکا آیا۔ زلیخا خواب کی ایک ہستی بن گئی۔ میں خواب میں محسوس کر رہا تھا کہ میں اسے اپنی آغوش میں کھینچ رہا ہوں۔

پھر بیداری۔ کمرے کی گرمی، کھڑکی سے ہوا کے سرد جھونکے۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اور اسی پر خیال انداز میں کوچ میں لیٹا رہا۔ میرا خیال

هوس

چند لمحوں کے لئے زلیخا سے ہٹ گیا۔ تصویریں، اردو رسالے، اردو رسالوں میں نظمیں، جدید اردو شاعری، اور اس کے بعد مجھے اپنی چند نظمیں یاد آگئیں۔ جو مختلف رسالوں میں بھیجا تھیں۔

دفعتاً ایک خیال میرے دماغ میں بجلی کی طرح کوند گیا۔ کیوں نہ میں زلیخا کے لئے ایک نظم محبت لکھوں۔ یہ اظہار محبت کا بہترین طریقہ تھا۔ یہ طریقہ اس کے تعلیم یافتہ دماغ کی خود پسندی کو برانگیختہ کرے گا۔ یہ طریقہ اس کے جذبات کو براہ راست متحرک کرے گا۔

جس طرح دانتے نے "بیاترچے" کے لئے، میکائیل انجلو نے وتوریا کالونا" کے لئے اور بائرن نے بخرزا کے لئے نظمیں لکھیں، میں بھی زلیخا کے لئے کیوں نہ لکھوں۔ ایسی نظمیں جن کو زلیخا کے سوا اور کوئی نہ پڑھے۔

میری خود پسندی نے مجھے ترغیب دی۔ میں نے شاعری جیسی لطیف شے کو اپنا آلۂ کار بنانے میں دریغ نہ کیا۔ اور میں اٹھ کر منہ ہاتھ دھونے لگا۔ نظم کا خیال میرے ذہن میں پختہ ہونے لگا۔

نظم کے متعلق مضامین، متفرق بحریں میرے خیال میں آنے لگیں۔ میں کاغذ اور پنسل لے کر بیٹھ گیا۔ پھر احساس جمال نے مجھے ملامت کی کہ میں ایک لطیف فن کا غلط استعمال کر رہا ہوں۔ اس نظم کا مدعا مصلحت لئے ہوئے تھا اس میں صداقت نہ تھی۔ صداقت کے فقدان کے باعث اس نظم میں شعری جمال کا پیدا

ہونا ممکن نہ تھا۔

پھر دماغ کے عملی پہلو نے اپنی مدافعت کرتے ہوئے جواب دیا۔ کہ مشرقی شعراء کے قصیدے۔ . . . کیا وہ غرض کے لئے نہیں لکھے گئے تھے۔ مانا کہ ان میں وہ صداقت وہ قدرتی جمال نہ تھا لیکن کیا ان کی ظاہری خوبیوں سے انکار کیا جا سکتا ہے۔

میں نے نظم لکھنا شروع کی۔ میں آسانی سے مصرعے موزوں کر رہا تھا میں چاہتا تھا۔ کہ اس نظم میں اپنا پورا مافی الضمیر ظاہر کر دوں ۔۔ محبت کا اظہار ۔۔ محبت کا دعویٰ ۔۔ محبت کی دعوت ۔۔ اور اس کے ساتھ اس کے جذبات اس کی محبت کا یقین اور محبت کی بے گناہی . . . . اس کے سوا اور خدا جانے کیا کیا کچھ۔

الفاظ بحروں کی موزونیت ان سب کو سانچے سمجھ کر میں اپنا مدعا ان میں ڈھال رہا تھا۔ شاعری کی قوت اور شاعری کا عاشقانہ طرز خطاب بھی میں برابر باقی رکھنا چاہتا تھا۔

نظم مکمل ہو گئی۔ آج تک اس سے زیادہ مصنوعی نظم میں نے اور کوئی نہ لکھی تھی نظم کا انداز ظاہر کر رہا تھا۔ کہ اس میں جذبات کی صداقت کی ہوا تک نہیں لگی۔

میں اپنی محبت کو محبت نہیں کہہ سکتا تھا۔ "ہوس" اس کا موزوں ترین نام تھا۔ مگر اسی ہوس میں بعض لمحے حقیقی محبت کے محسوس کرتا میں اس کو یاد کر کے اپنے جسم میں ایک لطیف گرمی محسوس کرتا میں اپنے دل میں اس وقت تک پہنچنے کے لئے بیتاب ہو جاتا۔ ہاں سچی محبت کے لمحوں میں میں اپنی ہستی اور اس کی ہستی کو بالکل ایک سمجھتا۔

میں محسوس کرنے لگتا۔ کہ وہ مجھ سے جدا نہیں ہے وہ مجھ میں میرے خون میں، میری حرارت و زندگی میں سرایت کر چکی ہے۔

لیکن یہ لمحے پائدار نہ ہوتے۔

نظم کو میں نے ایک خوشبودار کاغذ پر نقل کیا۔ اور ایک خوشبودار لفافے میں بند کر کے اس پر صرف دو حرف لکھ دیئے "نذر زلیخا" ۔ ۔ لیکن یہ دو حرف بہت کافی تھے۔

میں اس لفافے کو اپنے قمیص کی جیب میں اپنے دل سے متصل رکھے رہا گویا میرا وہم اس میں میری محبت کی کشش پیدا کر دینا چاہتا تھا۔

شام کو زلیخا اپنے کمرے میں میز پر بیٹھی ہوئی کچھ کتابیں ڈھونڈ رہی تھی میں نے اس کے ہاتھ میں یہ خط دیدیا۔ اور بلا ایک لفظ کہے تیزی سے دروازے کے باہر نکل آیا۔ میرا قلب زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

میں کپڑے پہن کر باہر نکل گیا۔ آج نمائش کے انعامات ملنے والے تھے۔ ان میں سے پہلے انعام کا میری تصویر کے لئے اعلان ہو چکا تھا۔ اس غیر معمولی کامیابی سے میرا دل اتنا مسرور تھا۔ کہ اگر دوسری جانب وہ زلیخا سے نہ الجھا ہوتا۔ تو میں غالباً اپنے آپے سے باہر ہو جاتا۔

آج تقسیم انعامات کی شام تھی یہ لتے میں میرا دل زلیخا سے ہٹ کر اپنے ملنے والے انعام کی طرف متوجہ ہوا۔ میری تصویر "گناہ" جس میں میں نے برن جونز کی نقاشی کو بیرڈسلے کے خطوط کے ساتھ ملا کر خطوط کے ساتھ رنگ و تناسب کا ایک کامیاب نمونہ تیار کر دیا تھا۔

دوسری فضا

نمائش کی بہترین تصویر قرار پائی "گناہ" کو میں نے ایک عریاں نسوانی جسم دہن جوز کی ساخت کا بنا کر پیش کیا تھا جس کے اطراف آتشیں شرارے رہک رہے تھے اور شدت لطف کے ساتھ ایک عذاب کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ آگ کے شراروں کی نقاشی میں میں نے ابھری ہیئر ڈسلے کے فن سے پوری پوری مدد لی تھی مجموعی طور پر گناہ کا تخیل اور اس کا طریق اظہار بالکل میرا اپنا اور بالکل طبعزاد تھا۔

وہ انعام مجھے ملا میں کو وہ تصویر بھی گھر آگئی۔ چچا جان میری اس کامیابی سے بہت خوش تھے میں اندر گیا۔ توز لیخا مجھے آتا دیکھ کر میرے راستے سے دور ہٹ گئی اور اس کے بعد باتیں کرتے وقت وہ مجھ سے دور دور رہی میں خود ایک حجاب کو درمیان میں پاتا تھا۔ اور میں دل میں ڈر رہا تھا کہ کہیں چچی جان یا جمیل کو شک نہ ہو جائے۔

اپنے خط کے اس اثر کو میں نے قبولیت در رضا پر محمول کیا۔ اس کا یہ طریقہ پردہ کی مجھے نزدیک تر بلانے کی نشانی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے میں اپنے آپ کو بالکل کامیاب تصور کر رہا تھا۔

پھر میری تصویر کا ذکر آیا۔ سلیمہ نے اپنی معصوم ہنسی کے ساتھ کہا "نسیم تم اتنے بھولے بھالے معلوم ہوتے ہو تم نے وہ تصویر کیسے کھینچی ہوگی"

اس پر ایک خجل زہر آلود تبسم زلیخا کے رخ پر نمودار ہوا۔

سب باتیں کر رہے تھے لیکن وہ مجھ سے براہ راست گفتگو میں اجتناب کر رہی تھی۔ اس کا یہ اجتناب دن بھر باقی رہا۔ اس کی وجہ سے میں خود بھی ایک قسم کا حجاب

محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ مجھے اپنی کامیابی کا یقین تھا میں سوچتا تھا کہ کس طرح ایک اور قدم آگے بڑھاؤں۔

دوسرے دن اس نے تیز لہجے میں کہا "تمہاری کتابیں میں پڑھ چکی۔ انہیں واپس لے جاؤ۔"

میں نے اس کے لہجے میں ناگواری یا رضامندی کو تلاش کرنا چاہا۔ لیکن نخوت کے سوا کوئی اور چیز مجھے اس میں نظر آئی۔ تو وہ صرف حجاب تھا۔

میں نے کتابیں لے لیں۔ ان کو اپنے اسٹڈی میں ایک میز پر رکھ دیا اور خود کسی دوسرے کام میں مشغول ہو گیا۔

کچھ دیر کے بعد مجھے خیال آیا میں بھی کس قدر کند ذہن تھا میں نے وہ سب کتابیں اٹھائیں۔ اور ہر ایک کی ورق گردانی شروع کی۔ مجھے توقع تھی۔ کہ ان میں سے کسی ایک میں اس کا خط کوئی تحریر ضرور ہوگی۔

ایک کتاب میں مجھے اپنا ہی بھیجا ہوا لفافہ ملا جس میں میری نظم تھی۔ لفافہ چاک شدہ تھا نظم جوں کی توں تھی۔ اور اس کے سوا ایک حرف بھی نہ تھا۔

مگر پھر خود پسندی نے مجھے یقین دلایا۔ حجاب نے اسے خط لکھنے کی اجازت نہ دی ہوگی۔ اس نے اس نظم کو میرے پاس واپس اس لئے بھیجا ہوگا۔ کہ مجھے معلوم ہو جائے کہ وہ میری نظم پڑھ چکی ہے۔ میں اس کی خاموشی کو اس کی رضا کیوں نہ تصور کر دوں؟ پھر اس کا حجاب میرے دعوے کی دلیل تھا۔

اس کا اجتناب کم ہوتا گیا۔ اس نے مجھ سے کچھ اور کتابیں مانگیں۔ میں نے وہ کتابیں اسے دے دیں۔ وہ میرے سامنے ان کتابوں کے ورق الٹنے لگی۔ گویا وہ میری کسی اور تحریر کی متوقع تھی۔ لیکن کیا وہ اس تحریر کو جذبات کی آگ کے ساتھ ڈھونڈ رہی تھی؟ مجھے فوراً نظر آگیا۔ کہ اس کی حرکت کی تیزی، اس کے چہرے کی نخوت، رضا نہیں بلکہ مقابلے کا اظہار کر رہی تھی۔

۱۵

چچا جان کسی کام سے اندر آئے۔ اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے انہوں نے مجھے بھی اپنے کمرے سے بلا لیا۔ اور بہت دیر تک ادھر اُدھر کا ذکر ہوتا رہا۔ زلیخا بلا کسی تکلیف بلا خفیف ترین حجاب کے گفتگو میں برابر حصّہ لے رہی تھی میری نسبت وہ کچھ مذاقیہ جملے استعمال کر رہی تھی۔ گویا اس نے اپنی قوّت ارادی کی ایک مکمل جنبش کے ساتھ اس لمبے حجاب کو، اس پوری بے لبسی کو بیک لخت دور پھینک دیا تھا۔

اس کے جملوں میں میں ایک آدھ جگہ وہ طنز محسوس کرتا تھا جن کا مطلب میرے سوا اور کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔

اب مجھے احساس ہوا۔ کہ میں نے افعی کو بری طرح چھیڑ کر اس کو پورا موقعہ دیا تھا کہ وہ مجھ پر جی کھول کر حملے کرے۔

لیکن میں طبیعت کے اس تضاد سے حیران تھا۔ کیا یہ وہی زلیخا تھی جو میری قربت

کی وجہ سے جذبات کے غلبے سے کانپ اٹھتی تھی جس نے میرے دل کو اور اچھی طرح فتح کرنے کے لئے اپنے سینے کی نیم عریانی سے مدد لی تھی۔ تو کیا وہ سب نسوانی داؤ کا کھیل تھا؟

یا اس کا باعث رشک تھا، سلیمہ کی وجہ سے وہ سلیمہ اور سلیمہ سے زیادہ مجھ سے بلا سبب ناراض تھی؟ مگر یہ خیال بہت کمزور تھا۔ میں نے اس کو اپنے دل سے نکال دیا۔

تو کیا، وہ انجام پر نگاہ کرکے، ایک آخری، خوفناک کوشش کر رہی ہے۔ کہ اپنے دبے ہوئے جذبات کو مطلق ابھرنے نہ دے؟ ——

اصلی وجہ یہی تھی۔

تیسرے پہر کو پھر جمیل کے کمرے میں سلیمہ اور زلیخا دونوں موجود تھیں میں اندر داخل ہوا۔ اب زلیخا کے فقرے مخفی طنز کی جگہ کھلی ہوئی چوٹوں میں تبدیل ہو چکے تھے وہ چاہتی تھی۔ کہ خود بالکل بے گناہ اور مظلوم سمجھی جائے۔ اور اس جذباتی کشاکش سے نجات حاصل کرنے کے لئے سارا الزام، اصل سے بہت زیادہ الزام میرے سر رکھ کر، کسی ترکیب سے مجھے قصور وار ٹھہرائے۔ پھر بھی وہ اس تدبیر کے خطرے سے واقف تھی اس کا اپنا ماخوذ ہونا اس کو ڈرانے کے لئے کافی تھا۔ پھر اس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ نظم وہ مجھ کو واپس کر چکی تھی۔ اور چھٹی پر میرا نام نہ تھا۔

اس وقت پہلی مرتبہ اس کی زہریلی طبیعت سے ہوشیار رہنے کے خیال میں میں نے محبت کے کھیل میں غلطی کی۔ اس کے جملے میرے سوا، سب کچھ تقریباً مہمل اور بے محل

معلوم ہوتے تھے میں نے ان کا جواب اس بے پرواہی سے دینا شروع کیا کہ گویا مجھے اس سے ذرا بھی انس نہ تھا۔

بعض تلخ جملوں سے وہ اور کھٹک گئی۔ اور ناگن کی طرح اپنے حملوں کے لئے موزوں ترین مقام تلاش کرنے لگی۔ اس نے عورتوں کی آزادی کا تذکرہ چھیڑا میں اور جمیل ایک طرف تھے وہ اور سلیمہ دوسری طرف۔ سلیمہ تو صرف ہنس کر ایک آدھ جملہ بیچ میں بول دیتی۔ زلیخا برابر بولتی چلی جا رہی تھی۔

آخر اس نے کہا: "تمہارے ہی جیسے بدمعاش لوگ تو عورتوں کو آزاد نہیں ہونے دیتے۔"

اس جملے میں اس نے پوری طرح اپنے زہر کا استعمال کیا تھا۔ میں نے اس کا جواب ایک لاپرواہ قہقہے سے دیا جس کا مطلب اس کے لئے یہ تھا کہ اس کا یہ حربہ بیکار گیا۔ اور جمیل وغیرہ کے لئے یہ کہ وہ اس لفظ سے کھٹکنے نہ پائیں۔

جمیل چلا گیا۔ اب زلیخا تھی اور سلیمہ۔ زلیخا برابر مجھ سے اس جوش میں باتیں کر رہی تھیں۔ اور باتیں کرتے کرتے اس نے کہا "اگر تم میں ذرا بھی عقل ہوتی تو ایسی بیہودہ قوفی کی نظمیں نہ لکھا کرتے"۔

یہ جملہ میری نظم پر تھا۔ اس کے جواب میں میں کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے کہا۔ "مگر خدا کا خوف بھی تو کوئی چیز ہے"۔

اب میں سمجھا۔ اب تک اس اہم نقطے سے میری توجہ ہٹی ہوئی تھی۔ مذہب بحث تو تشین

لڑکیوں کا آخری سہارا ہے۔ زلیخا جیسی افعی طبیعت لڑکی صرف مذہبی ایقان کی وجہ سے وقتی طور پر محفوظ رہ سکی۔

میں ہی ان بے ربط جملوں کو سمجھ رہا تھا سلیمہ نہ ان جملوں کا مطلب سمجھ رہی تھی نہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بلا سمجھے ہوئے وہ بار بار ہنستی جاتی اور خاموش ہو جاتی۔

میں ان پے در پے حملوں سے تقریباً لاجواب ہو گیا میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس میں یہ غیر معمولی قوت ارادی کہاں سے پیدا ہو گئی تھی۔

میری شکست کے کچھ آثار میرے چہرے پر دیکھ کر اس کی نخوت متبسم ہوئی۔ اس کی نخوت نے اس کی پردہ نشین جنسیت پر ایسی زبردست فتح پائی تھی۔ کہ میں حیران تھا میں نے اب تک اس کی نفسی کیفیت کا پورا پورا اندازہ کر کے ایک ایک قدم بڑھایا تھا اس کے باوجود منزل مقصود ابھی کوسوں دور تھی۔

لیکن اس کے ایک جملے نے رنگ بدل دیا اور میرے سامنے ایک اور راستہ کھل دیا جو پہلے سے زیادہ خطرناک تھا کیونکہ اس میں تھوڑا سا حصہ ایک تیسری ہستی کی شرکت کا بھی تھا۔

اور وہ جملہ سلیمہ پر ایک چوٹ تھی "سلیمہ کی بھی بالکل یہی حالت ہے۔ اس کا بس چلے تو سب سے پہلے خاندان کا منہ کالا کرے"

سلیمہ کے معصوم ہنستے ہوئے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے آنسو دل اور غصے سے بھرآئے ہوئے لہجے میں کہا "تو خود ایسی ہو گی"

دوسری فضا

اب زلیخا کی انعیت کو اس کے رشک نے اور زیادہ بھڑکا دیا۔ اس نے نخوت سے لبریز لہجے میں کہا۔ "چل مردار مجھ سے باتیں بناتی ہے۔ اور ناولیں پڑھ پڑھ کر خاندان کو بدنام کرنا سیکھ۔"

پھر وہ مجسم رعونت بن کر سلیمہ پر حقارت کی ایک مکمل نظر ڈالتی ہوئی میرے پاس سے گزری۔ میں دروازے کے قریب ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ آئینے میں جذبات کی کشمکش سے خود مجھے اپنے چہرے میں کوئی نئی بات معلوم ہو رہی تھی۔ زلیخا میرے قریب پہنچ کر لمحے بھر کے لئے ٹھٹکی میں نے اس کے چہرے کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے اطمینان سے دیکھا۔

لرزش کی لہر اس کے جسم بھر میں سرایت کرتی ہوئی معلوم ہوئی میں بے اختیار مسکرانے لگا وہ کسی قدر خجل ہو کر جلد دروازے کے باہر نکل گئی۔

اس کی قوتِ ارادی اس کی نخوت کے باوجود دبی ہوئی نسوانیت پرندے کی وجہ سے بالکل دبی ہوئی معلوم ہوئی۔ نسوانیت اسے زیر کر رہی تھی۔

میں اپنے دل میں حیران تھا محبت و ہوس کی اس کشمکش کے ساتھ ساتھ اس نے اور میں نے بھی کتنے رنگ بدلے تھے۔ ایک حالت میں ہرگز یقین نہ آتا تھا کہ اس سے پہلی گزری ہوئی دوسری حالتیں اس قدر مختلف اس درجہ متضاد ہونگی۔

۱۶

سلیمہ اب تک آہستہ آہستہ رو رہی تھی۔ زلیخا کے چبھتے ہوئے جملوں نے اس کے معصوم دل کو انتہائی تکلیف دہ ٹھیس لگائی تھی۔

سلیمہ — آہ بے چاری سلیمہ تخیل میں بھی تو گناہ سے غبار ابھی آلودہ نہ تھی وہ ان چند ہستیوں میں سے تھی جن سے مصوّر فرشتوں کا تخیل مستعار لیتے ہیں۔ اور اس کی ایسی بے خیال، سراپا معصومیت ہستی کے لئے یہ الفاظ — اور پھر اپنی بہن کی زبان سے — کس درجہ دل شکن اور زہر آلود تھے۔

میں نے اپنا فرض محسوس کیا کہ اُسے تسلّی دوں۔ اسے اس کے کمرے تک پہنچا دوں میں اٹھا اور اس کی طرف جاتے وقت وہی ردِ عمل جو میں نے زلیخا کے جملے کو سنتے وقت سوچ رکھی تھی میرے دماغ میں کوند گئی۔

میں زلیخا کو شکست دینے، زلیخا کو مطیع کرنے کے لئے اس کی آتشِ حسد کو اور بھڑکانا چاہتا تھا میں نے تجویز یہ سوچی تھی کہ زلیخا کو جلانے کے لئے میں اس کے سامنے سلیمہ سے زیادہ ارتباط کا اظہار کروں۔ اس میں ایک خطرہ تھا کہ کہیں وہ سلیمہ کو بدنام کرنے کی خاطر، اس کے متعلق کچھ طوفان نہ اٹھائے۔ مگر جمیل خود بخود میرے اور سلیمہ کیلئے حفاظت کا سامان بن سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ادھر زلیخا کے منہ سے سلیمہ کے خلاف کوئی بات نکلی ادھر جمیل اسی طرح اس کی خبر لے گا۔

یہ خیال لمحے بھر کے لئے میرے ذہن میں پیدا ہو کر مستقل ہو گیا۔ کھڑکی پر صراحی

رکھی تھی۔ میں نے اس میں سے پانی انڈیلا۔ اور سلیمہ کو دے جا کر دیا۔

"ذرا پانی پی لیجئے۔ تو آپ کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ اور ایسی باتوں کا آپ خیال بھی نہ کیا کیجئے"۔

میں نے جمیل سے سلیمہ اور زلیخا کے باہمی تکدّر کے بہت سے قصے سنے تھے لیکن سلیمہ نے آج تک مجھ سے یا میرے سامنے زلیخا کی شکایت نہیں کی تھی لیکن اس کا قصہ اور اس ہمدردی کے بعد قدرتی طور پر اس نے مجھ پر کچھ اعتماد محسوس کیا۔ اور کچھ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی خاطر ہچکیوں کے درمیان اس نے کہنا شروع کیا "روز روز... کی... ان... باتوں سے... کلیجہ چھلنی ہو جاتا ہے"۔

میں نے کچھ تسلی دینا چاہی لیکن موقعے کے مناسب الفاظ مجھے نہیں مل سکے اس خاموشی کے عالم میں اس نے میرے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔

وہ دو ایک گھونٹ پانی پی چکی۔ تو گلاس میرے ہاتھ میں دے دیا میں نے گلاس ہاتھ میں لئے ہوئے اس سے کہا "اب اپنے کمرے میں چل کر منہ دھو ڈالیئے"۔

وہ اٹھی۔ میں نے گلاس قریب ہی ایک اسٹول پر رکھ دیا۔ اس کے لئے دروازہ کھول دیا۔ پھر آگے بڑھ کر اس کے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ اس کے ساتھ اس کے کمرے کی کھڑکی کے پاس پہنچ کر میں نے ایک اور گلاس میں پانی بھر کر آگے دیا۔ اس نے پانی سے منہ پر دو تین چھینٹے مارے میں نے اس کا تولیہ اسے اٹھا کر دیا۔ اور گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر پھر اسی جگہ رکھ دیا۔

وہ تولئے سے اپنا منہ پونچھنے لگی۔ اس کی سسکیوں کی آواز کم ہوتے ہوتے

اب تقریباً بالکل ختم ہو چکی تھی۔ منہ پونچھنے میں اس کی نظر سنگار میز کے آئینے پر پڑی۔ اور وہ بے اختیار مسکرانے لگی۔ "زمین پہ باراں شکے بعدؔ فلک پہ بجلی" کا عکس آئینے میں دیکھ کر میں بھی بے اختیار مسکرانے لگا۔ اس کے پیچھے میری شکل بھی آئینے میں نظر آرہی تھی۔ مجھے مسکراتے دیکھ کر وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ جس میں پھر اسی صدفی معصومیت کی جھلک تھی۔

پھر اس نے اسی معصومانہ انداز سے شانوں کو نیچے جھکا کے، گردن پھیر کے اپنی بڑی بڑی معصوم آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اس وقت میرے دل کا جمال پرست عنصر اس پر سے ایک سوز لیخائیں نثار کرنے کو تیار تھا۔

وہ خود بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر تازگی واپس آچکی تھی۔ اس نے مجھے معصوم متبسّم انداز میں کہا۔ "بیٹھو نسیم!"

میں بیٹھ گیا۔ اس ہمدردی سے اس کے دل میں مجھ پر اعتماد سا ہو گیا۔ اس کے علاوہ آج زلیخا کے جلے کٹے لہجے سے وہ سمجھ گئی تھی۔ کہ زلیخا مجھ سے بھی ناراض ہے۔

اس نے اب سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ "زلیخا آپا کی ہمیشہ سے یہ عادت ہے۔ جس کو دیکھا اسی کے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ صبح سے شام تک اماں جان اور ابا جان سے بہتان لگایا کرتی ہیں۔"

میں نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے نرمی سے جواب دیا۔ "آپ ان کی باتوں کا خیال بھی نہ کیا کیجئے۔"

دوسری فضا

اس نے کسی قدر رنجیدہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ کہاں تک خیال نہ کروں۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جس دن کسی نہ کسی طرح وہ میرا دل نہ جلاتی ہو۔ اور اماں جان بھی ہمیشہ انہیں کی سی کہتی ہیں۔

میں نے بالکل ناواقفیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ کیوں کیا وہ ہمیشہ آپ سے خفا رہتی ہیں ؟"

اس نے کہا "ہاں" اس کی آواز سے پھر اس کی قلبی تکلیف کا اظہار ہو رہا تھا۔ پھر اس سے نہ رہا گیا۔ یکلخت اس کے چہرے کا رنگ سرخ سے سپید ہونے لگا اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ اس نے دانتوں سے ہونٹ کاٹ کر اتنا کہا میں نے کئی مرتبہ اس زلیخا کے ہاتھوں مار بھی کھائی۔ اور کبھی اُف تک نہ کی۔ پھر وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس کی قلبی تکلیف سے میں نے بھی اذیت کا ایک پہلو دل میں محسوس کیا اگر اس وقت مجھ سے پوچھا جاتا۔ کہ تمہیں زلیخا سے زیادہ محبت ہے یا نفرت۔ تو شاید جواب نہ دے سکتا۔

میں سلیپر کو ذرا سا پہننے کے لئے اٹھ ہی رہا تھا۔ کہ دروازہ کھلا میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا جمیل داخل ہو رہا تھا۔ وہ وہیں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا اس نے مجھ سے آہستہ سے پوچھا "کیا بات ہے ؟"

میں نے بہت مختصر طریقے پر پورا قصہ اور زلیخا کے جملے دہراتے ہوئے اس انداز سے

کہ زلیخا سے وہ اور زیادہ برہم ہو جائے۔ اور اگر زلیخا، سلیمہ کی شکایت کرے تو اچھی طرح اس کی خبر لے سکے۔

جمیل برابر بے قرار تھا۔ اس کی خاموشی ظاہر کر رہی تھی۔ کہ یہ رویہ داور کا اس کا دل بے چین ہو رہا ہے۔ وہ اپنی بہنوں میں سلیمہ کو بہت زیادہ چاہتا تھا۔ اگر زلیخا خود اس کے متعلق کوئی ایسا جملہ کہتی۔ تو اسے اس قدر غصہ نہ آتا۔ اس نے مجھ سے کہا "تم یہیں ٹھہرو" پھر اسی غصے میں بھرے ہوئے انداز سے وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا دروازے کے باہر نکل گیا۔

سلیمہ کا دل میرے اندازے سے بھی زیادہ نازک تھا میرے اور جمیل کے تسلی دینے پر بھی اس کے آنسو برابر جاری تھے۔ برا بر تکلیف سہتے سہتے اب اس کے دل میں برداشت کی انتہا ہو چکی تھی۔ اسی کی سی معصوم صفت لڑکی خاموش رہ سکتی تھی۔

جمیل غصے میں بھرا ہوا جب کمرے کے باہر گیا۔ تو وہ سیدھا چچا جان کے پاس گیا تھا اور وہاں غصے میں کانپ کانپ کے وہ غیر معمولی قوت کے ساتھ زلیخا کے طرز عمل زلیخا کی طبیعت کی شکایت کر رہا تھا۔ وہ اپنے والد کی بے وجہ طرفداری کی ان کے منہ پر نکتہ چینی کر رہا تھا۔

چچا جان بھی جمیل کے اس حقیقی جوش کی وجہ سے بالکل خاموشی سے سن رہے تھے جب جمیل تھک گیا۔ تو انہوں نے صرف اتنا کہا "اچھا میں ابھی آتا ہوں"

جمیل چلا آیا۔

کچھ دیر کے بعد چچا جان آئے ذرا دیر میں چچی، اور زلیخا بھی آپہنچیں، اور سلیمہ کو روتے دیکھ کر اس نے کہا "افوہ یہ مکر"
جمیل اپنے آپ میں نہیں تھا۔ اس نے ڈانٹ کر کہا "بس خاموش"
چچا جان نے آہستہ سے کہا "جمیل میری موجودگی کا تو خیال کرو۔ جو کچھ تم کو کہنا ہے۔ نرمی کے ساتھ کہو"
جمیل نے پورے قصے سنانا شروع کئے۔ اور اپنی داستان کو امینہ کی شادی سے پہلے کے زمانے سے شروع کرکے اس واقعے پر لاکر ختم کیا۔ زلیخا بیچ میں کچھ بولنا چاہتی تھی۔ تو چچا جان کا ہاتھ یا جمیل کی آگ برسانے والی نگاہیں اسے روک دیتیں۔
چچا جان نے صرف اتنا کہا "کیوں زلیخا"
زلیخا نے اپنے تمام حربے بیکار پاکر آخری حربہ استعمال کیا۔ اور "یہ کمبخت تو میرا دشمن ہے" کہکر پوری مظلومیت کے انداز سے رونا شروع کر دیا۔
جمیل کا غصہ اب بھی ویسا ہی باقی تھا۔ اب تک تو وہ صرف تصویر کا دوسرا رُخ دکھا رہا تھا۔ اب اس نے کھلم کھلا حملہ شروع کر دیا۔ "بے وجہ" "بے قصور سلیمہ کو تو تم نے یہ کہا۔ اور میں تمہاری ساری باتیں بیان کروں۔ اس روز جب ہم فورٹ میں سامان خریدنے جا رہے تھے۔ تو تم موٹر کی کھڑکی سے منہ نکالے جھانک رہی تھیں۔ کیوں ہو اچھا پھر کل سہ پہر جب ابا جان سے کچھ لوگ ملنے آئے تھے تم زینے پر یا برکھڑی رہیں۔ اور ان سب نے تم کو دیکھا ہوگا۔ اس وقت تم کو شرم نہیں آئی جواب بیچاری سلیمہ کے پیچھے پڑی"

چچا جان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ انہوں نے زلیخا کی طرف کڑوی نظروں سے دیکھا۔ اور اس کے رونے کی پروا کئے بغیر کہا "کیوں مردود"
اور وہ باہر چلے گئے۔ زلیخا کم سے کم کچھ دنوں کے لئے ان کی نظروں سے گر گئی۔
چچی جان خاموش کھڑی تھیں۔ انہوں نے سلیمہ سے کہا "اچھا بیٹی اب منہ پونچھ ڈالو۔ اور چلو تمہارا جی چاہے تو نسیم کے کمرے میں جاکر نئی تصویریں دیکھو۔۔۔۔"
اور زلیخا کی ۔۔ خیال کئے بغیر اس کو اسی حالت میں چھوڑ کر وہ چلی گئیں۔
جمیل مسکرا رہا تھا۔ اس نے سلیمہ کا ہاتھ پکڑ کے کہا "نسیم نے جو نئی تصویریں منگوائی ہیں وہ دیکھیں گے"
زلیخا کی نخوت نے آج تک اتنی زبردست شکست نہ کھائی تھی۔ آج وہ ناگن تو نظر آرہی تھی۔ مگر ایسی ناگ جس کے زہریلے دانت نکال دیئے گئے ہوں۔
جمیل اور سلیمہ کمرے کے باہر جانے لگے۔ وہ ان کی طرف زہر بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ان کے پیچھے پیچھے میں بھی جانے لگا۔ وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ وہ برابر رو رہی تھی۔ میں نے اس کی نگاہوں میں تھوڑی سی حسرت پائی۔
میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے ایک خواہش محسوس کی۔ کہیں اس کے پاس رک جاتا ہوں لیکن جمیل کی آواز سنائی دی "چلو نسیم"

میں نے نئی آئی ہوئی تصاویر کے تمام مرقعے نکال کر میز پر ڈھیر کر دیئے۔ جمیل

دوسری فضا

دو تین منٹ کے بعد کہنے لگا۔ "ٹینس کا وقت ہوگیا۔ میں جاتا ہوں۔"
وہ چلا گیا۔ سلیمہ برابر تصویریں دیکھتی اور باتیں کرتی رہی۔ میں نے ایک خفیف سی آہٹ محسوس کی، اور ایک جھلک دیکھ کر میں حقیقت کی تہ تک پہنچ گیا۔ زلیخا دروازے کے پیچھے آڑ میں چھپ کر ہم لوگوں کی نقل و حرکت دیکھ رہی تھی۔
شاید وہ بے چاری مضطرب تھی۔ کہ اس کی نخوت کے ساتھ اس کی محبّت بھی نہ چھن جائے۔

۱۷

میں عمداً کئی دن تک زلیخا سے کشیدہ رہا۔ میں اس کے جذبات سے کھیل کر ان کو اس قدر دردناک بنا دینا چاہتا تھا۔ کہ پھر اس میں سرکشی کی کوئی قوّت باقی نہ رہے۔
اس واقعے کے دوسرے یا تیسرے روز اتفاقاً سلیمہ کو بخار آگیا۔ بخار معمولی تھا لیکن میں اس کے پلنگ کے پاس بیٹھ کر گھنٹوں اسے پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ اکثر بیچاری زلیخا جھانک جھانک کر دیکھا کرتی۔
زلیخا اسی گھر میں اب گھر کی ملکہ نہ رہی تھی۔ پھر بھی اپنی سابق حیثیت حاصل کرنے کی وہ برابر کوشش کر رہی تھی۔ اور آہستہ آہستہ پہلے چچی اور پھر چچا جان کے دل میں جگہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اسے اچھا سبق مل رہا تھا۔
شام کے کوئی تین بجے ہوں گے۔ سلیمہ کے پاس میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔ سلیمہ

نے کمزور الفاظ میں کہا "نسیم فوراً تم ہی دوا دے دو۔"

میں نے دوا انڈیلی اور اسے پلانے کے لئے بڑھا۔ ایک گلاس میں تازہ پانی کُلّی کرنے کے لئے لیا۔ اور اگالدان اٹھا کر اس کے پلنگ کے اوپر رکھ دیا۔ پھر میں نے خود سہارا دے کر اسے اٹھایا۔ وہ میرے سہارے بیٹھی تھی۔ اس نے پہلے کُلّی کی۔ پھر دوائی پی۔ پھر کُلّی کی۔ لیکن اسی طرح بیٹھی رہی۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے اپنی پیشانی پر رکھا اور کہا "نسیم دیکھو میرا بدن بہت زیادہ تو نہیں جل رہا ہے۔"

میں نے کہا "نہیں۔"

لیکن ابھی یہ لفظ میری زبان سے نکلنے بھی نہیں پایا تھا۔ کہ میں نے دروازے کی آہٹ محسوس کی۔ اور زلیخا دروازے پر نظر آئی۔ سلیمہ نے پکار کر کہا "کون زلیخا آپا۔ آؤ۔ آتی کیوں نہیں۔"

لیکن وہ اپنے کمرے کی طرف سیدھی چلی گئی۔ میں نے پھر سلیمہ کو اسی طرح لٹا دیا۔ دوا کا گلاس، اگالدان اور پانی کا گلاس پھر اپنی اپنی جگہ رکھ دیا۔ بسم اللہ بی کو پکار کر کہا۔ کہ تم ذرا یہاں ٹھہرو۔ اور خود زلیخا کے کمرے کی طرف چلا۔

کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر پہنچ کر دیکھا۔ زلیخا میز پر سر رکھے زار و قطار رو رہی ہے۔ میری آہٹ پانے پر بھی وہ اسی طرح روتی رہی۔ میں بالکل خاموش کھڑا تھا۔

کچھ دیر کے بعد اس نے سر اٹھایا۔ اس کی نگاہوں میں ملامت اس قدر نمایاں تھی۔

دوسری فضا

کہیں نے اپنے چہرے پر زبردستی لاپرواہی کے آثار پیدا کیے۔

تو اب زلیخا بھی تاب نہ لا سکی۔ رشک نے آخر اسے اعترافِ شکست پر مجبور کر دیا۔

میں نے کہا: "کیوں خیریت تو ہے" پھر اپنے الفاظ میں طنز کی چبھن خود میرے کانوں کو ناگوار معلوم ہوئی۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں اس کی اس شکست سے ایک وحشیانہ خوشی محسوس کر رہا تھا میں نے پھر کہا: "کیوں اس مرتبہ آپ نے شکایت نہیں کی"

اس کی ساری نخوت اس حملے سے عود کر آئی۔ اس نے پھر میری طرف مقابلہ کرنے والی نگاہوں سے دیکھا۔ آنسوؤں کی روانی میں بھی اس کی مکمل نخوت مجھے کارفرما نظر آ رہی تھی۔

میں مسکرا کر اس کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ دروازے کے باہر سے میں نے دیکھا وہ میز پر سر رکھے پہلے سے زیادہ تکلیف کے ساتھ سسکیاں بھر بھر کر رو رہی ہے۔

میرے دل میں ایک مغلوب کرنے والا جذبہ پیدا ہوا۔ کہ میں پلٹ کر اسے اپنے سینے سے لگا لوں۔ مگر دور سے جمیل کی آواز مجھے پکارتی ہوئی سنائی دی

۱۸

سلیمہ اچھی ہو گئی۔ اس کا معصوم تبسم پھر اپنی اصلی حالت پر واپس آ گیا۔

ہوس

ایک دن ہم سب اندرونی ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ ہیں معمول کے خلاف کئی دن کے بعد زلیخا کے قریب کے صوفے پر جا بیٹھا۔ اور میں نے کئی بار زلیخا کے جسم میں لغزش طاری ہوتے دیکھی۔ وہ اٹھی اور مجھ سے کچھ پوچھنے لگی۔

اس بیچاری کی حالت واقعی قابل رحم ہو رہی تھی۔ ہیں ایک پردہ نشین لڑکی کے دبے ہوئے جذبات کو زندہ کر چکا تھا! اس کی ابتدائی گریز کی کوششوں کی میں کافی سزا دے چکا تھا۔

مگر ایک حیوانیت جو انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ مجھے اس کی تکلیف ہیں، اس کی نفسی تکلیف میں، ایک قسم کا وحشیانہ لطف عطا کر رہی تھی۔

پھر بھی وہ پہلی عورت تھی۔ جسے میں نے محبت کے لئے انتخاب کیا تھا۔

وہ میرے قریب کھڑی مجھ سے کچھ باتیں کر رہی تھی۔ اس کا بے ہنگم سر، اس کا بے ہنگم جسم، اس کا چہرہ حسن سے بالکل معرا معلوم ہو رہا تھا۔ مگر اس ہیں وہ چیز سب سے زیادہ نمایاں تھی، "نسوانیت" اور میرے لئے "زندگی کی آگ"۔

اس کی جنبش، اس کے جسم کی حالت، ہر چیز سے نسوانیت برستی تھی۔

اس روز وہ حرارت جو اب تک میرے سینے میں دبی ہوئی تھی۔ بھڑکنے لگی۔ سلیمہ کی ملکوتی صورت پھر دل سے محو ہونے لگی۔ اور اس کی جگہ زلیخا نے لے لی۔

وہ احساس، وہ دلکش اور خوفناک احساس ایک عورت سے محبت، ایک عورت سے نزدیکی کا احساس ہیں پھر اپنے دل میں ابتدائے عشق کے جذبات کی تازگی کو محسوس کر رہا تھا۔

دوسری فضا

اور اب تک زلیخا میرے لئے کیا تھی۔ صرف ایک خیال، ایک جلاتا ہوا خیال، ایک حقیقت منتظر جس تک میں ابھی پہنچنے نہ پایا تھا۔

زلیخا کی تصویر اب تک ناتمام پڑی تھی۔ میں نے زلیخا سے کہا "صرف ایک دن میں وہ تصویر مکمل ہو جائے گی۔"

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "اچھا تو کب اس کو پورا کرو گے۔"

میں نے کہا "آج مجھے فرصت ہے۔ آپ وہی کپڑے پہن کے آجائیے۔"

تھوڑی دیر میں وہ تصویر اتروانے کے کپڑے پہن کر آگئی۔ میں نے ایزل پر پھر اس کی نامکمل تصویر نصب کر دی اور چند منٹوں میں ——مشکل پندرہ منٹ میں—— موقلم کی آخری گردشیں ختم کرکے تصویر اتار دی۔ زلیخا اٹھ کے قریب آگئی۔ اور ایک ادائے حیرت و مسرت سے اس تصویر کو دیکھنے لگی۔

اور میں خدا جانے کن کن نظروں سے زلیخا کو دیکھ رہا تھا۔

"ذرا خشک ہو جائے تو پھر اس قابل ہو جائیگی کہ آپ کے کمرے میں پہنچا دی جائے۔"

یہ کہہ کر میں نے ایک کونے میں وہ تصویر کھڑی کر دی۔ زلیخا، اس اثنا میں کچھ کانپتی ہوئی کچھ اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی ایک کوچ پر جا کر بیٹھ گئی۔ اور الٹ پلٹ کر کچھ تصویریں دیکھنے لگی۔

میں کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میں ایک قسم کا اضطراب محسوس کر رہا تھا آخر کار جرأت کرکے میں اسی کوچ کے دوسرے سرے پر بیٹھ گیا۔

ہوس

زلیخا برابر کانپ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کے جسم کا ریشہ ریشہ کانپ رہا تھا۔ میں نے وہی برقی لہر اپنے سارے جسم میں محسوس کی۔ میں زلیخا سے اور کسی قدر نزدیک ہو گیا۔ اور اس نزدیکی کے ساتھ گویا نرم شعلے میرے جسم کے اطراف سلگ رہے تھے۔ ان کی لطیف حرارت بڑھتی گئی۔ میں زلیخا سے اور قریب ہو گیا۔

اس کا ایک ہاتھ کوچ پر تھا۔ میں نے اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ اور اس کے جسم کی لرزش اور بڑھ گئی۔ میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ پھر میرا ایک ہاتھ اس کے پنجے سے لے کر اس کی کہنیوں تک آہستہ آہستہ پہنچا۔ اب بھی اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ میں نے اپنا ایک ہاتھ اس کے دوسرے شانے پر رکھ کر آہستہ سے کہا "زلیخا"

وہ خاموش تھی لیکن وہ برابر کانپ رہی تھی۔ اس کا چہرہ شدتِ جذبات سے پیہم رنگ بدل رہا تھا۔ میرا دوسرا ہاتھ اس کی گردن میں حمائل ہو گیا۔ میں نے اس کے کانوں میں پھر کہا "زلیخا۔ پیاری زلیخا"

اس نے آنکھیں بند کیں۔ میں نے اسے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ اور اس کے رخساروں کو، اس کے لبوں کو، اس کی آنکھوں کو محبت کی پیہم مہروں سے پُر کر دیا۔ اس کی قمیص کے بٹن کھل گئے تھے۔ اور تصویر کھنچوانے کی قمیص کے چوڑے گلے سے اس کا شفاف عریاں سینہ صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کو اپنے سینے سے

لگالیا۔ اور "پیاری زلیخا"، پیاری زلیخا کے جواب میں اس نے بھی میرے کان میں کانپ کر آہستہ سے کہا "نسیم، پیارے نسیم"

"زلیخا تم میری ہو۔ تم ہمیشہ میری رہو گی"

اس نے تنفس کی گرمی میں جواب دیا۔ "ہاں پیارے ہمیشہ تمہاری"

دفعتاً مجھے خیال آیا۔ یہ دن کا وقت ہے۔ کوئی دیکھ نہ لے میں جلدی سے ہٹ گیا زلیخا سے آہستہ سے کہا میری پیاری اب بہت سنبھل کے قدم رکھنا کہیں کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھنا۔ کہ کسی کو شک ہو جائے۔

وہ میری طرف کانپتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے اٹھایا۔ اس نے اپنی قمیض کا گلہ برابر کر لیا دروازے کے قریب پہنچ کر ایک طویل پیار کے بعد وہ کانپتی ہوئی چلی گئی۔

میں اپنے اسٹڈی میں تنہا رہ گیا۔ اگر میرا مقصد محض نفسانی محبت نہ تھی۔ تو میں اپنی صنفی محبت میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اب تک جذباتِ نفسانی کا خیال میرے دل میں مضبوطی سے آنے بھی نہ پایا تھا۔

اب تک میں زلیخا کو صرف اس لئے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کہ اس کے رخساروں کو، اس کے لبوں کو چوموں۔ اسے معصومیت کے ساتھ اپنے سینے سے لگا تا رہوں لیکن اسے اپنی نفسانی خواہشوں کا شکار نہ بناؤں۔

لیکن کیا میں اپنے نفسانی جذبات کو اس قدر قابو میں رکھ سکوں گا،

ہوس

معاً میری نظروں کے سامنے خوفناک انجام پھر گیا۔ اگر میں اس بن بیاہی لڑکی کو اپنی ہوس پر قربان کر دوں۔ تو اس کا حشر کیا ہوگا؟ ہمیشہ کے لئے تباہی و بربادی۔
میں نے اس خیال کو اپنے دل سے نکال دینے کی کوشش کی۔ میں اس لڑکی سے ہمیشہ کے لئے معصوم محبت کرتا رہوں گا۔ وہ کبھی میری ہوس کا شکار نہ بننے پائے گی۔

۱۹

میں نے ہوس سنفلیہ کے خیال ہی کو اپنے دل سے نکال دینے کی کوشش کی۔
اس وقت تک سفلی جذبات کبھی میرے ذہن پر پڑیادہ غالب نہ آتے تھے جنسیت میرے نزدیک صرف اس سے ظاہری محبت تک محدود تھی۔
خوف کے ایک احساس کے ساتھ انجام، میری نگاہوں کے سامنے پھرنے لگا رسوائی بدنامی، زندگیوں کے خطرے، مستقبل کی تباہی اور خدا جانے کیا کچھ ایک طرف تھا۔
اور دوسری طرف صرف ہوس۔
زلیخا نے اس رات کو کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ بیچاری پردہ نشین لڑکی اپنے جذبات کے اس زور میں خدا جانے کیا کچھ محسوس کر رہی ہوگی۔ محبت، حجاب، تاسف تردد، شرم، خوف اور کیا کیا کچھ۔
اب تک وہ بے گناہ تھی۔ لیکن اسی کو وہ بہت بڑا گناہ سمجھتی تھی۔

دوسری فضا

میرے دل میں عقل و ہوس، واقعات و جذبات کی کشمکش برابر جاری تھی۔ رات آ چکی تھی۔ میں سلیپنگ سوٹ پہن کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ میں کروٹیں بدل رہا تھا۔ میری روح زلیخا کے ساتھ تھی۔ اب گھر بھر میں سناٹا چھا چکا تھا۔ اس خوفناک خاموشی میں اپنے کو اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ بالکل اکیلا یہاں تک کہ میری روح بھی میرے پاس نہ تھی۔

ہوس عقل کو، جذبات واقعات کو شکست دے چکے تھے۔ میں ڈریسنگ گاؤن پہن کر چپکے سے اٹھا۔ رات کی تاریکی ہر طرف طاری تھی۔ ہر کمرے کی روشنیاں گل ہو چکی تھیں۔ ہر قدم پر بے انتہا خوف، بے انتہا کمزوریاں مجھے ہراساں کرتی نظر آ رہی تھیں مگر میں ان سب سے بچتا ہوا زلیخا کے کمرے کے قریب پہنچا۔ ذرا سی جنبش سے دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھلنے کی خفیف سی آواز سے میرا خون سرد ہو گیا۔ میں کمرے کے اندر پہنچا۔ اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

زلیخا نے آہستہ سے کہا۔ "کون؟" وہ جاگ رہی تھی۔ میری طرح محبت کی پہلی رات میں تنہائی اس کو پریشان کر رہی تھی۔

میں نے آہستہ سے کہا "میں"

زلیخا نے پھر محبت کے شیریں و دردناک لہجے میں کہا "کون نسیم۔ مجھے یقین تھا تم آ جاؤ گے"

میں اس کے بستر پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس کے سر کو میں نے اپنے ایک زانو پر رکھ لیا پھر اس کے منہ کو چوم کر میں نے کہا "تم مجھے یاد کر رہی تھی۔

ہوس

اس نے آہستہ سے کہا "میرے پیارے نسیم" اور میرے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اس نے اپنے سینے سے دبایا۔

میں نے اسے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ وہ میری طرف بے معنی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے خون کی گردش کے ساتھ اپنے قلب و دماغ کو ایک نہ ہر گداز آتش میں مبتلا پایا۔ اور اس بے اطمینانی کے عالم میں پہلی مرتبہ میرے قلب نے اقرار کیا "جنسی محبت اور نفسانی ہوس میں کوئی فرق نہیں"۔

گھر میں اندھیرا تھا لیکن جذبات کی اس شورش میں میں نے کسی احتیاط کی پرواہ نہیں کی۔ میں نے اس کے کمرے کی لائٹ روشن کر دی۔ میرے ہاتھ کے ایک جھٹکے سے اس کا لباسِ شبِ خوابی اس کے جسم سے الگ ہو گیا۔ میں روشنی میں ایک عورت کے جسم کی جانسوز عریانی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں ایک انسان ہونے کے سوا مصور بھی تھا۔ شباب کے ساتھ مجھ میں جمال پرستی بھی تھی۔

وہ میرے سامنے بالکل عریاں کانپ رہی تھی۔ مجھے تھیوفیل گاٹیر کے "مادام دموپاں" کا وہ عدیم النظیر منظر یاد آ گیا جس میں ایک شاعر نے حسن پرستی کو جذبات میں تلاش کیا تھا۔ میں نے اسے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ اور ہاتھ بڑھا کر روشنی گل کر دی۔

رات کی تاریکی نے ہم دونوں کو اپنے آغوش میں لے لیا۔

صبح کاذب کو تقریباً چار بجے جب میں اس کی خوابگاہ سے نکل کر اسٹڈی میں پہنچا

تو میں اپنے آپ کو ایک بالکل بدلا ہوا انسان محسوس کرتا تھا میری روح میں ایک عظیم الشان انقلاب ہو چکا تھا۔ اور میری طرح ایک اور ہستی بھی بالکل تبدیل ہو چکی تھی۔

میں نے کھڑکی سے جھانک کر سمندر کی طرف دیکھا۔ سمندر کی موجوں کی زمزم آوازمیں ایک مضحکہ خیز ہنسی کی جھلک میں نے محسوس کی۔

آہ! فطرت ہمیشہ انسانی کمزوریوں، انسانی ناعاقبت اندیشیوں کا اسی طرح مذاق اڑاتی رہے گی۔

۲۰

دن گزرتے گئے محبت، شباب اور نشے کے دن لیکن محبت کا راز فاش ہم نے نہ پایا۔ پہلے چند دن شباب اور جوش تپش کے ایک طوفان میں گذرے۔ پہلی محبت خدا جانے کیا کچھ ہوتی ہے۔ میں رفتہ رفتہ محسوس کرنے لگا کہ زلیخا کو مجھ سے جس قدر محبت تھی میں اس کا عشر عشیر بھی اس کو چاہ نہ سکتا تھا اس طویل کش مکش نے اس کے نسوانی جذبات کو اس درجہ کامل کر دیا تھا کہ اب میں اس کے لئے سب کچھ تھا وہ تقریباً میری پرستش کرتی تھی۔

میں اکثر سوچنے لگتا۔ کہ یہ وہی زہر بھری، افعی طبیعت زلیخا ہے؟ جنونِ محبت نے اس کی پوری زہریلی طبیعت کو ختم کر دیا تھا۔ وہ مجھ میں، میرے خیال میں اس درجہ

منہمک رہتی کہ زجمیل کو اس سے کوئی شکایت پیدا ہوتی نہ سلیم کو۔
جذبات کی اس شدت سے میں دن بدن ڈرتا جاتا۔ کہ کہیں یکلخت محبت کا راز ظاہر نہ ہو جائے۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کی رسوائی و بے عزتی کا سبب نہ بن جائے۔
لیکن میں تعجب کرنے لگتا۔ کہ دوسروں کے سامنے اس کا رویہ بالکل بدلا ہوتا۔ وہ کبھی میرا مذاق اڑانے لگتی۔ کبھی میرے متعلق کوئی بات بول جاتی۔ ہرگز میری طرف غیر معمولی توجہ کا اظہار نہ کرتی۔ میں دم بخود ہو جاتا۔ یہ وہی زلیخا تھی۔ جو تنہائی کے لمحوں میں مجھے اپنی محبت، اپنی ہستی، یہاں تک کہ اپنی روح کا مختارِ کل سمجھتی۔
بہرکیف دن گزرتے گئے۔ افتراء و کذب کی نقاب میں حقیقتیں ہمیشہ نہاں رہتی ہیں اور بسا اوقات آخر تک کوئی انہیں جاننے نہیں پاتا۔
میرا امتحان ختم ہو گیا۔ میں کامیاب بھی ہو گیا۔ اور مجھے والد کا ایک خط ملا جس نے واقعات کی رفتار میں ایک حیرت انگیز تبدیلی پیدا کر دی۔
قدرت کی ستم ظریفی سے عقل انسانی بالکل حیران رہ جاتی ہے۔ خط کی عبارت یہ تھی۔
عزیزی نسیم سلمہ

جیتے رہو۔ یہاں سب بخیریت ہیں۔ تمہاری کامیابی سے حقیقی مسرت ہوئی۔ انگلستان سے تمہارے بھائی جان کا خط آیا تھا جس میں انہوں نے تمہارے متعلق بہت زور دے کر لکھا تھا کہ تم کو مقدونیہ کے شاہکاروں کے مکمل مطالعہ کے لئے ایک سال کے لئے یورپ بھیج دوں۔ باوجود آمدنی کی تنگی اور مصارف کی زیادتی کے ان کے دلائل بہت صاف

معلوم ہوئے۔ خیر تمہاری یہ تمنا بھی آرزو پوری ہو جائے گی۔ اور تم ایک سال کے لئے انگلستان بھیجد ئیے جاؤ گے۔ آج سے تین مہینے بعد رائل اکاڈمی کی نمائش ہے۔ تم یہاں سے جلد ہی روانہ ہو جاؤ۔ تو اچھا ہے تاکہ نمائش میں شریک ہو سکو۔

جانے سے پہلے دو ہفتے کے لئے حیدرآباد آجانا تاکہ کچھ دن میرے ساتھ بھی رہ سکو اس کے علاوہ تم کو ایک بہت ضروری امر کے متعلق کچھ لکھنا میرا فرض ہے بھائی صاحب کا خط میرے نام آیا ہے۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ سلیمہ کی شادی تمہارے ساتھ ہو مجھے ذاتی حد تک اس سے زیادہ مسرت میرے لئے ناممکن ہے اور مجھے تمہاری سعادتمندی سے کامل توقع ہے کہ تم بھی اس نسبت کو پسند کرو گے۔ سلیمہ بہت اچھی بھولی بھالی لڑکی ہے تم انگلستان جا رہے لیکن یاد رکھو اگر تم نے وہاں انتہائی پاکبازی سے زندگی بسر نہ کی اور اس نسبت کا خیال نہ رکھا۔ تو تم کو میری جائداد سے ایک حبّہ بھی نہیں مل سکیگا۔ اور میں مجبوراً تم کو اپنی فرزندی سے عاق کر دوں گا۔

اس نسبت کو طے شدہ سمجھو بعض مصالح کی وجہ سے وہاں جانے سے قبل تمہاری شادی نہیں ہو سکے گی لیکن وہاں سے واپسی پر فوراً تمہاری شادی سلیمہ سے ہو جائے گی۔ جس قدر جلد ہو سکے۔ تم حیدرآباد آجاؤ۔ میں تمہارے لئے روپیہ کا انتظام کر رہا ہوں گھر میں میری جانب سے سب کو آداب۔ فقط دعاگو۔ وسیم الحسن

تقریباً اسی مضمون کا ایک خط چچاجان کے پاس بھی گیا تھا۔ انہوں نے مجھے بلا کر کہا مصلحتاً یہ نسبت ابھی بالکل پوشیدہ رہے گی؟

منہمک رہتی کہ جمیل کو اس سے کوئی شکایت پیدا ہوتی نسلیم کو۔
جذبات کی اس شدت سے دن بدن ڈرتا جاتا۔ کہ کہیں لطافت محبت کا راز
ظاہر نہ ہوجائے۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کی رسوائی و بے عزتی کا سبب نہ بن جائے۔
لیکن میں تعجب کرنے لگتا۔ کہ دوسروں کے سامنے اس کا رویہ بالکل بدلا ہوتا۔ وہ
کبھی میرا مذاق اڑانے لگتی کبھی میرے متعلق کوئی بات بول جاتی۔ ہر گز میری طرف غیر
معمولی توجہ کا اظہار نہ کرتی۔ میں دم بخود ہوجاتا۔ یہ وہی زلیخا تھی۔ جو تنہائی کے لمحوں میں
مجھے اپنی محبت، اپنی ہستی یہاں تک کہ اپنی روح کا مختار کل سمجھتی۔
بہر کیف دن گزرتے گئے۔ افترا و کذب کی نقاب میں حقیقتیں ہمیشہ نہاں رہتی
ہیں اور بسا اوقات آخر تک کوئی انہیں جاننے نہیں پاتا۔
میرا امتحان ختم ہوگیا۔ میں کامیاب بھی ہوگیا۔ اور مجھے والد کا ایک خط ملا جس نے
واقعات کی رفتار میں ایک حیرت انگیز تبدیلی پیدا کردی۔
قدرت کی ستم ظریفی سے عقل انسانی بالکل حیران رہ جاتی ہے۔ خط کی عبارت
یہ تھی۔ عزیزی نسیم سلمہٗ
جیتے رہو۔ یہاں سب بخیریت ہیں۔ تمہاری کامیابی سے حقیقی مسرت ہوئی انگلستان
سے تمہارے بھائی جان کا خط آیا تھا جس میں انہوں نے تمہارے متعلق بہت زور دیکر لکھا تھا
کہ تم کو مقدوی کے شاہکاروں کے مکمل مطالعے کے لئے ایک سال کے لئے
یورپ بھیجدوں۔ با وجود آمدنی کی تنگی اور مصارف کی زیادتی کے ان کے دلائل بہت صاف

دوسری فضا

معلوم ہوئے۔ خیر تمہاری یہ تمنا آرزو پوری ہو جائے گی۔ اور تم ایک سال کے لئے انگلستان بھیجدیئے جاؤگے۔ اب سے تین مہینے بعد رائل اکاڈمی کی نمائش ہے۔ تم یہاں سے جلد ہی روانہ ہو جاؤ۔ تو اچھا ہے تاکہ نمائش میں شریک ہو سکو۔

جانے سے پہلے دو ہفتے کے لئے حیدرآباد آجانا۔ تاکہ کچھ دن میرے ساتھ بھی رہ سکو اس کے علاوہ تم کو ایک بہت ضروری امر کے متعلق کچھ لکھنا میرا فرض ہے بھائی صاحب کا خط میرے نام آیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ سلیمہ کی شادی تمہارے ساتھ ہو۔ فی الحال حد تک اس سے زیادہ مسرت میرے لئے ناممکن ہے اور مجھے تمہاری سعادتمندی سے کامل توقع ہے کہ تم بھی اس نسبت کو پسند کروگے۔ سلیمہ بہت اچھی بھولی بھالی لڑکی ہے تم انگلستان جا رہے ہو لیکن یاد رکھو اگر تم نے وہاں انتہائی پاکبازی سے زندگی بسر نہ کی اور اس نسبت کا خیال نہ رکھا۔ تو تم کو میری جائداد سے ایک حبّہ بھی نہیں مل سکیگا اور میں مجبوراً تم کو اپنی فرزندی سے عاق کر دوں گا۔

اس نسبت کو طے شدہ سمجھو بعض مصالح کی وجہ سے وہاں جانے سے قبل تمہاری شادی نہیں ہوسکے گی لیکن وہاں سے واپسی پر فوراً تمہاری شادی سلیمہ سے ہو جائے گی۔

جس قدر جلد ہو سکے۔ تم حیدرآباد آجاؤ۔ میں تمہارے لئے روپیہ کا انتظام کر رہا ہوں گھر میں میری جانب سے سب کو آداب۔ فقط دعاگو "وسیم الحسن"

تقریباً اسی مضمون کا ایک خط چچا جان کے پاس بھی گیا تھا۔ انہوں نے مجھے بلا کر کہا "مصلحتاً یہ نسبت ابھی بالکل پوشیدہ رہے گی۔"

میں قدرت کی اس ستم ظریفی پر حیران تھا۔ میں نے ایک لڑکی کا مستقبل ہمیشہ کیلئے تباہ کر دیا تھا۔ اور مجھے اس کے انعام میں ایک فرشتہ سیرت لڑکی دی جا رہی ہے کیا قدرت کا انتقام یہی ہے؟

میں اس نسبت سے خوش بھی تھا۔ جاتے ہوئے میں نے دور سے جلتی ہوئی نظروں سے سلیمہ کو دیکھا۔ اور زلیخا کی محبت میرے دل سے محو ہونے لگی۔ زلیخا کا بے ہنگم جسم اور اس کی زہریلی طبیعت پھر مجھے خوفناک معلوم ہونے لگی۔

میں ایک فرشتے کے ساتھ جنّت کی طرف پرواز کرنے والا تھا۔

۲۱

حیدر آباد میں والد سے رخصت ہو کر، سفر کی تیاری کے لئے میں پھر بمبئی پہنچا۔ یہاں جمیل وغیرہ تمام ضروری سامان خرید چکے تھے۔ پاسپورٹ مجھے مل چکا تھا جہاز "مانٹوا" دوسرے دن روانہ ہونے والا تھا۔ اس میں میری نشست محفوظ کرائی جا چکی تھی۔

وہ دن تیاریوں میں گزر گیا۔

شام کے وقت زلیخا اور سلیمہ دونوں اندرونی ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے دونوں کو میں نے ایک جانچنے والی نظر سے دیکھا۔ زلیخا میں اب میرے لئے وہ جنسی کشش ختم ہو چکی تھی۔ میں اب جنسی اور نفسانی محبت کی سرحد سے گزر چکا تھا۔ زلیخا کے بے ہنگم جسم اور زہریلی روح میں مجھے بلند تر جذبات کا جواب نہ مل سکتا تھا۔

دوسری فضا

پھر میرے ضمیر کی رہی سہی آگ نے میرے نفس کی ملامت کی۔ "تو نے اس لڑکی کو اپنی نفسانیت پر قربان کر کے اس کا مستقبل برباد کر دیا۔ اور اب ایک حسین تر لڑکی کے لئے اسے چھوڑ رہا ہے۔"

ضمیر کی آواز بیکار تھی۔ نفس، جسے اب میری جمال پرستی مدد پہنچا رہی تھی سلیمہ کے معصوم لطیف تبسم کی طرف نگاہِ شوق سے دیکھ رہا تھا۔

میں برابر زلیخا کی بیتابی محسوس کرتا رہا۔ اس کی محبت، اس کی پرستش کا مرکز اس سے دور ہو رہا تھا ۔۔۔ شاید ہمیشہ کے لئے جتنی مرتبہ میں نے اس کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ آج اس میں وہ عاقبت اندیشی نہ تھی۔ وہ دوسروں کے سامنے بھی اپنے کو سنبھالنے کی فکر سے لاپرواہ تھی۔

چند لمحے کے لئے اسے موقع ملا۔ وہ آ کر مجھ سے لپٹ گئی "نسیم کیا تم سچ مچ چھوڑ کر چلے جاؤ گے" اس کی طرف سے سرشی کافور ہونے لگی۔ تھوڑی دیر کے لئے سلیمہ کا تازہ خیال دل سے محو ہونے لگا۔ اور میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "میں بہت جلد واپس آ جاؤنگا۔"

اس کی آنکھوں سے برابر آنسو نکل رہے تھے دروازے پر کچھ آہٹ معلوم ہوئی میں ہٹ کر دور کھڑا ہو گیا۔ جمیل آ کے پھر مجھے تیاری میں مدد دینے لگا۔

اس رات کو میں بمشکل نصف گھنٹہ سویا ہوں گا۔ جمیل تو تقریباً بالکل نہیں سویا، لیکن ان کے علاوہ ایک ہستی نے رو رو کے تڑپ تڑپ کے رات بسر کی۔ یہ زلیخا تھی سوائے میرے کوئی اس کے سوز دروں سے واقف نہ تھا۔

دوسرے دن یعنی میری روانگی کے دن، روانگی سے چند گھنٹے پہلے، جمیل میرا ہاتھ پکڑ کے کمرے کے ایک گوشے میں لے گیا۔ اور مجھے ایک کرسی پر بٹھا کر، خود قریب کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور رازداری کے لہجے میں کہنے لگا۔

"نسیم تم جارہے ہو۔ مگر دیکھو اس نسبت کو نہ بھولنا۔ وہاں کسی نانبائی یا درزی کی لڑکی کے پنجے میں نہ پھنس جانا۔ محض تمہاری توقع پر سلیمہ کے تمام پیام رد کئے جا چکے ہیں۔"

میں نے زبان سے کوئی جواب نہ دیا۔ میری خاموشی کو اس نے اثباتی جواب تصور کیا۔ اور اس کے بعد پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

"اس کے علاوہ ایک بات اور کہ میں نے اب تک تم سے ذکر نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے تمہاری نسبت سلیمہ کے ساتھ قرار پائی۔ سلیمہ کو تم سے محبت ہے۔"

محبت؟ . . . یا میرے خدا میرے حواس جواب دے رہے تھے۔ واقعات کی اس تیز رفتاری نے مجھے بالکل ششدر کر دیا۔ میں نے اڑے ہوئے رنگ کے ساتھ پوچھا: "کیا؟"

اس نے جیب سے ایک چھوٹی سی نوٹ بک نکالی۔ اور پھر کہنے لگا "سنو پورا قصہ یہ کہ زلیخا کے بے بنیاد الزامات سنتے سنتے اس کے دل پر نفسی اثر یہ پڑا۔ کہ وہ تم کو خود بخود چاہنے لگی۔

میں حیرت سے اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ اور جمیل اپنا پسینہ پونچھ کر پھر مجھ سے کہنے لگا: "اس نے اپنے دل کا راز کسی سے نہ کہا۔ صرف اس نوٹ بک میں وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے لکھتی رہی۔ اور اتفاق سے یہ نوٹ بک میری نظر پڑ گئی۔

دوسری فضا

یہاں تک پہنچکر وہ رُک گیا۔ میری طرف دیکھنے لگا۔ میں استعجاب اور جذبات کی کشمکش سے نقشِ حیرت بنا ہوا سن رہا تھا۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا: "میں نے اس کو بہت دھمکایا۔ ڈرایا۔ اور اس نے قسمیں کھا کھا کر مجھے یقین دلایا۔ کہ اس نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جو قابلِ شرم ہو۔ اور اس نے یہ بھی کہا۔ کہ تم خود اس کی محبت کے حال سے بیخبر ہو۔ میں نے پھر اسے پورا نشیب و فراز سمجھایا۔ مگر نسیم حسن سے میں نے "آر لڈ بنٹ کا مائل اسٹونس" پڑھا تھا میں اس قدر تنگ خیال نہ رہا تھا۔ میں نے ایک لطیف پیرائے میں ابا جان سے ذکر کیا۔ انہوں نے پہلے تو ایک خفیف سا اختلاف کیا کہ سلیمہ عمر میں تم سے بڑی ہے مگر پھر وہ اور والدہ دونوں راضی ہو گئے۔ اور انہوں نے چچا جان — یعنی تمہارے والد سے خط و کتابت کر کے تمام معاملات پختہ کر لئے لیکن اصل واقعات کی خبر نہ ابا جان کو ہے نہ اماں جان کو اور نہ چچا جان کو۔ . . . . اور اس نسبت کا حال زلیخا اور انیسہ وغیرہ کو بھی معلوم نہیں۔"

پھر اس نے غیور و سنجیدہ آواز میں کہا۔ "بتاؤ تم وعدہ کرتے ہو؟"

زلیخا میری نظروں سے حرفِ غلط کی طرح مٹ چکی تھی۔ میں نے اس نئے انکشاف سے متاثر ہو کر کہا: "میں قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں۔ کہ میں سلیمہ اور صرف سلیمہ سے شادی کرونگا۔"

میں اس نئے انکشاف پر استعجاب و مسرت کے انتہائی عجیب و غریب جذبات محسوس کرتا تھا۔ کیا واقعی اس تمام عرصے میں جب میں زلیخا کے پیچھے دیوانہ تھا سلیمہ بھی خاموشی سے مجھ سے محبت کرتی رہی۔ کیا اس کی معصوم آنکھوں، ملکوتی حُسن کے پیچھے محبت کی آگ

روشن بخشی۔

مجھے کسی طرح یقین نہ آتا تھا۔

میں نے بالآخر جمیل سے کہا" جمیل مجھے یقین نہیں آتا۔ اس کی معصوم صورت۔۔۔"

جمیل نے کہا "نسیم، تمہارے چہرے کو دیکھ کر پڑھی لکھی لڑکیاں اگر کوئی ایکٹنگ محسوس کریں تو کوئی خلافِ توقع بات نہیں ہے۔ نوٹ بک وہ اس میں سلیمہ کے اعترافات ہیں۔ اب تو وقت نہیں۔ اسے جہاز پر پڑھنا۔ اور اس کی وجہ سے یورپ میں تم سلیمہ کو نہ بھول سکو گے۔"

پھر کچھ دیر کے بعد وہ کہنے لگا "نسیم، میں سلیمہ کا حقیقی بھائی نہیں ہوں۔ اس وقت میں نے جو باتیں تم سے کی ہیں وہ عام حالات میں کوئی بھائی نہیں کر سکتا۔ مگر ہم نئے ہندوستان کے باشندے ہیں۔ ہمارا ہر قدم ترقی کی طرف اٹھے گا۔ اس لئے میں نے بے حجاب ہو کر پوری حقیقت تم سے بیان کر دی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ تمہارے آزاد خیالات سے تو میں ہمیشہ اتفاق کرتا رہا۔"

پھر جمیل نے کہا "انگریزوں میں انگوٹھیوں کی تبدیلی کی رسم بہت اچھی ہے میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ محض طور پر اس نسبت کو پختہ تر کرنے کے لئے تم آپس میں انگوٹھیاں بدل لو" یہ کہہ کر اس نے دو خوبصورت ہیرے کی انگوٹھیاں نکالیں۔ خود باہر چلا گیا۔ اور پھر سلیمہ کو ساتھ لے کر چلا آیا۔

اس نے کاروباری لہجے میں سلیمہ سے کہا "سلیمہ گھبراؤ نہیں۔ شرمانے کی بات نہیں تم کو اماں جان کی پرانی ہدایتوں پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں نسیم سے تمہاری شادی ہوگی۔

دوسری فضا

اماں جان کی نہیں ہوگی۔ "نسیم کے ہاتھ سے یہ انگوٹھی لے کر پہن لو۔"

وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں اس لڑکے کی عجیب و غریب طبیعت اس کی حاضر دماغ عقلیت پر غور کر رہا تھا۔

سلیمہ کی معصوم بڑی بڑی آنکھوں میں محبت کی بیتابی کے ساتھ حجاب کی آگ اب اس انکشاف کے بعد صاف نمایاں تھی۔

آہ دونوں بہنیں مجھ سے محبت کرتی رہیں۔ زلیخا کی محبت زیادہ مادی تھی۔ اس نے میری ہوس کو بہت جلد متوجہ کر لیا۔ سلیمہ کی ملکوتی صورت اس کی محبت کا حجاب بنی رہی۔ میں اس کے دل کا راز آخر تک نہ جان سکا۔

زلیخا کی تصویر زنگا ہوں کے سامنے ظاہر ہو کر پھر مٹنے لگی۔ سلیمہ میرے سامنے کھڑی تھی اب بھی وہ مجھے ایک۔ فرشتہ معلوم ہوتی تھی۔ میں اپنی جیسی سیاہ کار ہستی کو اس کے قابل نہ پاتا تھا۔

اس کی ایک انگلی میں میں نے انگوٹھی پہنا دی۔ دوسری انگوٹھی خود میں نے پہن لی۔ تو یہ خواب نہ تھا۔ یہ ایک دل خوش کن حقیقت تھی۔ یہ معصوم فرشتہ سیرت، فرشتہ صورت لڑکی واقعی میری تھی میں نے اس کے شانے پکڑ کے بہت نرمی، بہت آہستگی سے اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ اس کے جسم میں وہ لرزش نہ تھی جو ہمیشہ زلیخا کے بدن میں پائی جاتی تھی۔ اس کی معصوم آنکھوں میں کتنا حجاب تھا۔

وہ محبت کرتی تھی لیکن اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ محبت کیا چیز ہے۔

افسوس

جمیل پھر آ کر سلیمہ کو اپنے ساتھ لے گیا۔ میں اسی جگہ جذبات کی کشمکش کا شکار بنا کھڑا رہا۔ زلیخا داخل ہوئی اس کا جسم کسی قدر بے ہنگم معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی نسوانیت سے میں سیر ہو چکا تھا۔ میں تنفر کا سا جذبہ محسوس کر رہا تھا۔ میں ایک فرشتے کی جاودانی محبت کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ جنسی محبت، نفسانی محبت کی جنبیت اب میرے لئے فنا ہو چکی ہے

شاید میری نگاہوں میں بھی لاپرواہی کے آثار تھے۔ زلیخا میرے قریب آئی۔ اس کا چہرہ رات بھر کے آنسوؤں سے سرخ تھا۔ اب بھی وہ لاکھ ضبط کر رہی تھی مگر زارہ قطار آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے میں نے اپنے دل میں وہم کا سا جذبہ محسوس کیا۔

اس نے مجھ سے لپٹ کر میرے کان میں سرگوشی کی "میرے نسیم۔ ۔ ۔ میرے۔ ۔ ۔"

وہ کچھ اور نہ کہہ سکی وہ کوئی بہت ضروری بات کہنا چاہتی تھی۔

میں نے کہا "کیا۔ ۔ ۔ کیا؟"

شاید میری آواز میں بھی بے مروتی تھی۔ اس نے میری طرف مظلومیت کی نگاہ سے دیکھا اور بدنصیبی کے تلخ ترین احساس کے ساتھ کچھ کہا۔ اس کے بچہ ہونے والا تھا۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں محسوس کر رہا تھا۔ کہ مجھ پر بجلی سی گری۔ پھر بھی میں نے اس کو ہاتھ کے اشارے سے رونے سے منع کیا۔

یہ میرے گناہ کا لرزہ خیز ترین خمیازہ تھا۔ پہلی مرتبہ مجھے اپنی بدبختی کا احساس ہوا۔ میں ایک بدنصیب ہستی کو خاک میں ملا چکا تھا۔ میری ہوس ایک اور زیادہ بدنصیب ہستی کو اس دائرۂ مصیبت میں لانے کا باعث بن رہی تھی۔

ممکن ہے کہ ان سب لوگوں سے دور رہ کر میں دنیاوی انجام سے کچھ دنوں تک محفوظ رہتا۔ مگر میرے ضمیر کی ملامت، میری روح کی بیماری، میرے قلب کا اختلاج، مجھے عمر بھر چین نہ لینے دیگا۔ ایک معصوم کی تمام تر قلبی کمزوریاں، میرے اس گناہ کی مجھے سزا دیتی رہیں گی۔

اور یہ غریب لڑکی ہمیشہ کے لئے بالکل برباد ہو چکی۔ اب عمر بھر اس کے لئے رونا، تکالیف، مصائب، ذلّت، رسوائی اور کیا کچھ نہ تھا۔

آہ انسانی کمزوریوں کے خمیازے، قدرت کا انتقام۔

یہ تو قدرت کا ایک طرفہ انتقام تھا۔ جو وہ زلیخا سے لے رہی تھی۔ میری باری بھی آنے والی تھی۔ اس وقت بھی میں اس خیال سے کانپ اٹھا۔ کہ خدا جانے قدرت مجھ سے کتنا سخت انتقام لے گی۔

جمیل کی آواز دور سے سنائی دی، "نسیم، جہاز کی روانگی کا وقت قریب آ رہا ہے بالہ، ڈیا پر چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ"

مجھے تعجب اور خوف معلوم ہونے لگا۔ اگر جمیل کو مجھ پر خفیف سا شک بھی ہو جائے تو اس کی سی تیز، وحشیانہ طبیعت کا لڑکا میری جان لئے بغیر باز نہ آئیگا۔

تیسری فضا

۱

میں جہاز کے عرشے پر کٹہرے کے پاس کھڑا، ابھی تک رومال ہلا رہا تھا جہاز کی تیز رفتار مجھے بمبئی سے ہندوستان سے ایک تکلیف دہ احساس کے ساتھ دور لئے جارہی تھی۔

میں بہت شدید اختلاجی کیفیت محسوس کر رہا تھا میرے دل و دماغ بالکل بیکار تھے۔ میرے ذہن پر ایک کہر سی چھا رہی تھی۔

میں نے اس کہر کو ہٹانے کی کوشش کی۔

مجھے ایک لڑکی سے محبت ہوئی۔ اور اس نے کچھ کشمکش کے بعد اپنی روح اور اپنا جسم دونوں میرے حوالے کر دیئے۔ اس جذبے کی سرمستی کا زمانہ گزر گیا۔ اب خوفناک انجام نظروں کے بالکل سامنے آرہا تھا۔

ایک لڑکی اور بھی تھی جو بہت دور سے مجھے ایک معصومیت، ایک بیگانہ ہی کے ساتھ چاہتی تھی۔ اور اب وہ میری ہونے والی تھی۔ لیکن اگر پہلی لڑکی کا راز فاش ہو گیا۔ تو دوسری لڑکی میرے ہاتھوں سے نکل جائیگی۔ اور میرا مستقبل بھی ایک بڑی حد تک تاریک ہو جائے گا۔ اس سے بھی قطع نظر—— افوہ بے چینی مجھے سوچنے اور خیال کرنے کا موقع بھی نہیں دے رہی ہے۔

میں اپنی خوابگاہ میں چلا آیا۔ اس کمرے میں میرا شریک ایک امریکن مشن کا پادری تھا جو کچھ عرصے کے لئے یورپ جا رہا تھا۔ وہ بمبئی میں ہی ہمارا تھا بہت جلد وہ اخلاق اور بے تکلفی سے باتیں کرنے لگا۔ مجھے اس کی باتوں میں کچھ دلچسپی معلوم ہوئی۔

پہلے بحری سفر کی وجہ سے حسب قاعدہ میری طبیعت خراب ہونے لگی۔ اور کئی دن بیماری کے ساتھ خیالات کی پریشانی، زلیخا کی بربادی کے وحشت ناک تصور اور سلیمہ کا تصور ہمیشہ خوفناک خوابوں کی طرح میری نظروں کے سامنے پھرتے رہے۔

جس کرب اور قلبی اذیت کے ساتھ میں نے وہ دو یا تین دن گذارے شاید ہی کبھی گذارے ہوں گے۔

جب کبھی میں قلبی اذیت سے تھک جاتا تو سلیمہ مجھے آفتاب کی ڈوبتی ہوئی کرنوں سے نکلتی ہوئی معلوم ہوتی۔ مگر پھر جہاز کے ایک ہچکولے کے ساتھ وہ تصور نظروں سے غائب ہونے لگتا۔ اور اس کے بجائے زلیخا کا روتا ہوا مظلوم بے بس چہرہ نظر آنے لگتا۔ میں غور کرنے لگتا۔ کہ یہی وہ نخوت بھری حکومت کرنے والی لیخا ہے جو اپنے بہن بھائیوں پر یہاں تک کہ

اپنے ماں باپ پر حکومت کرتی رہی۔ آج میں نے اس کی کیا حالت کر دی ہے۔
خیالات اور زیادہ تکلیف دہ ہو جاتے۔ میرا دماغ تھک جاتا۔ میں آنکھیں بند کر لیتا۔ اور مجھ پر غنودگی طاری ہو جاتی۔

۲

ذرا طبیعت سنبھلنے لگی۔ میں اکثر معتوّر کے جمال پرست زاویۂ نظر سے سمندر میں غروب آفتاب، طلوعِ ماہتاب کا منظر دیکھنے لگتا۔ اور جہاز کی جنبش کے ساتھ میں نیچے جھک کر اکثر یکساں سبز موجوں کی باہمی کشمکش، دور تک ان کا اتار چڑھاؤ دیکھتا رہتا۔ ایک موج میری نظروں کے سامنے اٹھتی اور پھر افتاں و خیزاں برابر آگے بڑھتی جاتی۔ میری نگاہیں اس کا تعاقب کرتی جاتیں۔ یہاں تک کہ وہ دوسری موجوں میں گم ہو جاتی۔ یا کبھی دور کوئی لائٹ ہوس نظر آجاتا۔ مجھے اس بیکراں سبزی میں دور سے وہ ایک سفید آسمانی جسم نظر آتا۔ میرا قیاس بغاوت کرتا۔ کہ وہ چونے اور پتھر کی بنی ہوئی عمارت نہیں ہے۔
ایک دن، مجھے سلیمہ کی وہ نوٹ بک یاد آگئی۔ میں اسے لے آیا۔ میں سلیمہ کے حقیقی جذبات سے ابھی تک بے خبر تھا۔ سلیمہ کے اعترافات کے ضروری اقتباسات یہ ہیں

میں کئی دن سے دیکھ رہی ہوں۔ نسیم کے چہرے کی سادگی، اس کی باتیں، نظر جھکا کر بات کرنے کا طریقہ مجھے بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔
نسیم آج مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کی ہنسی میں اب تک وہی بچپن ہے۔

اس کے بالوں کی نرمی مجھے بہت اچھی نظر آرہی تھی۔

آج نسیم زلیخا کی تصویر کھینچنے والا ہے نسیم نے میری تصویر کھینچنے کو نہیں کہا۔ وہ زلیخا کو مجھ سے زیادہ چاہتا ہے مگر مجھ سے باتیں کرتے وقت وہ پھر اس طرح باتیں کرتا ہے کہ میں سب بھول جاتی ہوں۔

نسیم کھڑا ہوا زلیخا کی تصویر اتار رہا تھا۔ اس حالت میں کھڑا ہوا وہ کتنا بھلا لگتا تھا۔ اس کے بال چمک رہے تھے۔ اس کی آنکھیں نیچے جھکی ہوئی تھیں۔ اس کی نیلی نیلی آنکھیں مجھے بہت پیاری معلوم ہوتی ہیں۔

آج بھی نسیم زلیخا کے پاس بیٹھا ہوا تھا میں آئی تو زلیخا نے میری طرف بہت بگڑ کر دیکھا میں نسیم کے پیچھے آکھڑی ہو گئی۔ میرا جی چاہتا تھا۔ کہ میں نسیم کے گلے میں باہیں ڈال دوں نسیم کی صورت میں اتنا بھولا پن اتنا بچپن معلوم ہوتا ہے کہ اس سے میں بڑی بے تکلفی سے باتیں کرنے لگتی ہوں میں اس کی کرسی کی پشت پر ہاتھ ٹیک کر اس سے باتیں کرنے لگی۔ خدا جانے میں نے زلیخا آپا کا کیا بگاڑا تھا وہ میری طرف گھور گھور کر دیکھنے لگیں۔

زلیخا آج بہت بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہی تھی۔ اس نے غصے میں بہت برا کہا۔

کہ خاندان کا نام مجھ سے ڈوبے گا۔ میں رونے لگی۔ نسیم نے اٹھ کر مجھے منہ دھونے کا پانی دیا۔ نسیم مجھے سمجھانے لگا۔ وہ کیسی اچھی طرح باتیں کرتا ہے۔ نسیم کی باتوں سے نہ معلوم کیوں میرا دل آپ ہی آپ خوش ہونے لگا۔ میں نے منہ پونچھ کر اپنی صورت آئینے میں دیکھی۔ نسیم کی صورت اور اس کے بکھرے ہوئے بال دیکھ کر میں ہنسنے لگی۔ نسیم بھی ہنسنے لگا۔ اس کی صورت دیکھ کر مجھے آپ ہی آپ محبت معلوم ہونے لگی۔ اگر وہ جمیل کی طرح میرا سگا بھائی ہوتا۔ تو میں اسے زیادہ چاہتی۔

مجھے نسیم سے محبت معلوم ہونے لگی۔ اور میں اسے اپنا دکھڑا سنانے لگی۔ میں پھر رونے لگی۔ تو وہ پریشان ہو گیا۔ اتنے میں جمیل نے آکر زلیخا کی شکایت کی اور ابا جان زلیخا سے خفا ہو گئے۔

میں سوچتی تھی۔ کہ میں جمیل کو زیادہ چاہتی ہوں یا نسیم کو معلوم نہیں کیا بات تھی نسیم کی صورت میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ جب نسیم مجھ سے باتیں کرتا ہے تو مجھے دلی خوشی ہوتی ہے۔

مجھے بخار آنے لگا۔ جب میں نسیم کا یہاں کا خیال کرنے لگتی ہوں۔ تو مجھے آرام معلوم ہوتا ہے نسیم آرام کرسی پر بیٹھ کر مجھے کتابیں پڑھ کر سناتا رہتا ہے میں نسیم کی صورت دیکھتی رہتی ہوں اس کی طرف سے نظر ہٹانے کو جی نہیں چاہتا۔

میرا جی چاہتا ہے۔ کہ میں نسیم سے لپٹ جاؤں۔ مگر میں لڑکی ذات ہوں۔ یہ بری بات سمجھی جائے گی۔ پھر نسیم کی صورت دیکھ کر مجھے ہمت نہیں پڑتی۔

میں نے نسیم سے وہ اپلانے کو کہا۔ نسیم کا سہارا لگا کے میں وہ واپس رہی تھی میرا جی چاہتا تھا کہ آخر تک ہمیشہ میں اسی طرح نسیم کا سہارا لگائے بیٹھی رہوں مگر نسیم وہ اپلا کے اُٹھ کے چلا گیا۔ مجھے بے چینی معلوم ہونے لگی۔

میں نے سلیمہ کی نوٹ بک بند کر دی۔ میں انسانی فطرت، انسانی نفسیات کی نیرنگیوں پر غور کر رہا تھا۔

مجھے پھر زلیخا کا خیال آیا۔ اور میں دہشت کی شدت سے لرزہ براندام ہو گیا۔

۳

زلیخا کا سب سے پہلا خط، جو مجھے انگلستان میں ملا۔ یہ تھا۔

"بمبئی"

پیارے، پیارے نسیم

تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے تم بہا بے مروّت۔ تم سا بے وفا دنیا میں اور کوئی بھی ہے؟ اس مصیبتیں برداشت کرنے کو اکیلی باقی رہ گئی۔ تمہارے موجود رہنے سے مجھے تقویت تو ہوتی۔ تمہارے جانے کے بعد اب دنیا بھر میں اپنے آپ کو تنہا پاتی ہوں۔

اگر کسی کو میرا راز معلوم ہو جائے تو کیا غضب ہو نسیم مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ دن بھر سر میں شدید درد رہتا ہے۔ میں بہت کمزور ہو گئی ہوں۔ اور آہ وہ راز مجھے مارے ڈالتا ہے۔ نسیم وہ راز چھپ نہیں سکے گا۔

میں نے ایک دن تنگ آکر زہر کھا لینے کا ارادہ کیا۔ اور تولہ بھر افیون چھپا کے رکھ لی رات کو میں سوچنے لگی۔ کہ افیون کھا کر ہمیشہ کے لئے سو جاؤں۔ افیم کی گولی کو میں اپنے لبوں تک لے گئی۔ مگر نسیم جان بہت پیاری ہوتی ہے۔ مجھے اپنی دکھ بھری خوفناک زندگی بھی موت سے اچھی معلوم ہوئی۔ نسیم میں خودکشی نہیں کر سکتی۔

تمہارے اسٹڈیو کی کھڑکیوں میں سے اکثر میں سمندر کی طرف دیکھنے لگتی ہوں مگر میں سمندر تک بھی خودکشی کے لئے نہیں پہنچ سکتی۔ یہاں ایک ایک چیز تمہاری یاد دلاتی ہے کبھی تنہائی میں دور سے تمہاری آواز سنائی دیتی ہے کبھی یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ تم کوئی تصویر کھینچتے کھینچتے تھک کر کہیں چلے گئے ہو۔ اور کچھ دیر میں واپس آجاؤ گے۔ اکثر رات کو میں سوتے سے جاگ پڑتی ہوں۔ اور مجھے معلوم ہونے لگتا ہے۔ کہ شاید تم میرے پلنگ کے پاس کھڑے ہو میں تمہاری آواز میں زلیخا، پیاری زلیخا، کی صدا سنتی ہوں۔ میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی ہوں۔ مگر تم یہاں کہاں .... تم مجھ سے ہزاروں کوس دور ہو۔ تم مجھے مصیبتیں بھگتنے کے لئے تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ نسیم تم میری طبیعت کو زہریلی طبیعت کہا کرتے تھے۔ میں لاکھ بری سہی۔ مگر اب سچ کہنا۔ تمہاری طبیعت مجھ سے ہزار گنی زہریلی ہے کہ نہیں؟ تم وہاں عیش و مسرت میں مجھے بالکل بھول گئے ہو گے۔ مجھے بعض اوقات تم سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ پھر تمہاری صورت میری نگاہوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔ تم سے اور نفرت؟—

نسیم میرا راز چھپ نہیں سکتا۔ خدا کے لئے مجھے بچاؤ۔ مگر تم کیسے بچا سکتے ہو؟

تم یہاں ہوتے۔ تو شاید کوئی تدبیر کر سکتے۔ میں اب بے بس ہوں۔ موت کے سوا بچاؤ کی کوئی صورت نہیں، اور خودکشی میرے کئے ہوتی نہیں۔ انجام کے خیال سے ہی دل میں کانپنے لگتی ہوں۔ میری اپنی رسوائی، بدبختی، ہمیشہ کے لئے تباہی، ان کے علاوہ خاندان کی بدنامی، سب کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔

نسیم خدا سے دعا کرو۔ کہ وہ مجھے دنیا سے اس بدنامی سے پہلے ہی اٹھالے خودکشی کی جرأت ہی نہیں۔ نہیں تو حرام موت بھی گوارا کر لیتی۔

میری آنکھوں سے برابر آنسو گر رہے ہیں۔ میرا دل تاب میں نہیں۔ مجھ میں اور کچھ لکھنے کی طاقت نہیں۔ اب رخصت۔

تمہاری ہمیشہ کے لئے تمہاری
زلیخا"

رائل اکاڈمی کی نمائش کے لئے میری ایک تصویر منظور ہو چکی تھی "مالابار کی پریاں" جس میں میں نے مشرقی تخیل کے ساتھ ہلکے رنگوں کے ذریعہ اپنے ان تمام تخیلات کو پیش کرنے کی کوشش کی جو میرے دل میں مینی میں اپنی اسٹڈیو کی کھڑکیوں سے نیچے دیکھتے وقت پیدا ہوتے تھے۔ سمندر سے نکلتی ہوئی پریاں جن سے میں نے زلیخا اور سلیمہ کو اپنا خیالی نمونہ بنایا تھا۔

میں اس عزت پر بہت مسرور تھا۔ کہ میری ایک تصویر کو رائل اکاڈمی جیسی عظیم الشان انجمن نے نمائش کے لئے منظور کیا۔

بھائی جان کو ڈگری مل چکی تھی۔ وہ آکسفورڈ سے کچھ دنوں کے لئے یورپ جا

رہے تھے۔ اور سوئٹزرلینڈ اور فرانس میں کچھ قیام کے بعد وہ ہندوستان واپس ہو نیوالے تھے
مجھے دیکھنے کے لئے اور کسی اور کام سے وہ دو تین دن کے لئے لندن میں ٹھہر گئے تھے۔
انہوں نے ایک دن برسبیل تذکرہ مجھ سے پوچھا "زلیخا کو تم نے بہت اچھی طرح
دیکھا ہوگا کیسی لڑکی ہے "
اس عجیب سوال پر متعجب ہو کر میں نے کہا "بہت اچھی۔ کیوں "
بھائی جان نے کہا "نہیں کچھ نہیں " مگر معاملے کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ شاید
بھائی جان اور زلیخا کی نسبت کے مراحل بھی طے ہو رہے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ کسی
طرح بھائی جان کو اس اذیت سے بچالوں۔ مگر مجھے زلیخا کی دائمی تباہی کا خیال آگیا۔
لیکن شادی سے پہلے اس کا راز فاش ہو جانا یقینی تھا۔ بدبختی کا تلخ ترین احساس
مجھے بالکل بدحواس کئے دے رہا تھا۔ میں نے صرف ایک لڑکی کی زندگی برباد نہیں کی بلکہ واقعتاً
طور پر شاید میں اپنے حقیقی بھائی کی زندگی تلخ کر دینے کا باعث بھی بننے والا تھا۔
بھائی جان کو مجھ سے انتہائی محبت رہی ہے اور اس محبت کا بدلا تھا۔ مگر میں نے
عمداً بھائی جان کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی تھی۔ قدرت کے عجیب و غریب شکنجوں
میں وہ گرفتار ہوتے جا رہے تھے۔
میں دل سے چاہتا تھا کہ کسی طرح بھائی جان یورپ چھوڑنے سے پہلے یہیں
شادی کرلیں۔ مگر پھر زلیخا کا خیال ؟
میرے ضمیر کی ملامت ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ بھائی جان کے ساتھ میں

افسوس

"ٹیوولی" میں ٹی وی کا "آف دی سِنی بروک فارم" دیکھ رہا تھا۔ مگر شدید قلبی اذیت کی وجہ سے میرا دماغ بالکل بیکار تھا۔

مگر بھائی جان چلے گئے۔ اور یورپ کی دلچسپیوں نے بہت جلد اس قلبی اذیت کا خاتمہ کر دیا۔

۴

میں فلارنس میں تھا۔ اور یُوفِت سی گیلری میں نشاۃِ ثانیہ کے شاہکاروں کے مطالعے میں مصروف تھا۔ وہیں تو لینگا کا دوسرا اہم خط مجھے ملا۔ یہ خط پہلے خط کے کئی مہینوں بعد آیا تھا۔

"ٹمرگ کشمیر"

پیارے نسیم

سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اس عرصے کے روح فرسا حالات کس طرح لکھوں۔ مگر اب اتنے دن گزر چکے ہیں۔ کہ طبیعت میں کچھ سکون پیدا ہو گیا ہے۔ سنو۔ میں مختصر الفاظ میں پورا قصہ سناتی ہوں۔

نسیم وہ راز چھپ نہ سکا۔ ابّا جان اور امّاں جان دونوں کو معلوم ہو گیا۔

ابّا جان کی متحمل اور مستقل مزاج طبیعت اس صدمے کی تاب نہ لا سکی۔ اور انہوں نے خودکشی کر لی۔ جیل نے ان کی موت کے باعث کو بالکل چھپا دیا۔ اور قلب کی حرکت بند ہونے سے موت کا واقع ہونا بتایا۔ لیکن امّاں جان بھی اس صدمے سے نیم جان ہو گئیں۔ اور اس کے بعد دو ہفتے کے اندر اندر ڈبل نمونیا بھی ہو گیا۔ اور وہ بھی چل بسیں۔ آہ نسیم۔ ان

دونوں کی موت کا باعث میں ہوں۔ اور تم بھی میرے برابر کے حصّہ دار ہو۔

جمیل نے پورے حواس سے کام لیا۔ کہ بدنامی زیادہ نہ ہو۔ اس نے چچا جان (یعنی تمہارے والد) کو ایک خط لکھا۔ اور اس میں تحریر کیا۔ کہ میری صحت بہت خراب ہے اور وہ مجھے کشمیر لے جانا چاہتا ہے۔ اس نے سلیم کو انیسہ آپا کے پاس بھجوا دیا۔ اور مجھے اپنے ساتھ یہاں کشمیر لے آیا تاکہ یہاں میں بے رسوائی اپنے اس قابل شرم راز، اور اس ذلت سے نجات پاؤں۔ یہاں آنے کے مہینہ بھر بعد ایک مرا ہوا بچّہ پیدا ہوا۔

اس کے بعد میں بخار وغیرہ میں برابر مبتلا رہی میں جمیل کو حیرت سے دیکھتی ہوں اسے مجھ سے کتنی نفرت تھی۔ لیکن اب اس کی محبت اس کی فراست سے میں حیران ہو جاتی ہوں۔ جمیل نے اس عرصے میں ایک بات بھی ایسی نہیں کہی جس سے میرے دل کو ٹھیس لگتی۔ وہ بھی میرے ساتھ اکثر رو یا کرتا تھا۔

جمیل نے تمام معاملات کو اس قدر چھپایا۔ اس لئے کہ اس اثناء میں تمہارے بھائی جان کے ساتھ میری نسبت کی گفت و شنید ہو رہی تھی۔ وہ ڈر رہا تھا۔ کہ کوئی اس راز سے واقف نہ ہو جائے۔ خیر خاندان کی حد تک رسوائی نہیں ہوئی۔ مگر میرے پیارے ماں باپ میری بدولت دنیا سے اٹھ گئے۔ آہ میں نے اپنے والدین کو خود قتل کیا۔

تم نے میرے پہلے خط کا جواب نہیں دیا۔ اور تم کیوں دیتے لگے۔ تم وہاں گلچھرّے اڑا رہے ہو گے۔ تم کو اس کا کیا خیال۔ کہ تمہاری بدولت میرا کیا حال ہوا۔ اور میری زندگی کیسی برباد ہوئی۔

تمہارے بھائی جان واپس آگئے ہیں۔ اور زیور کالج میں پروفیسر مقرر ہوگئے ہیں وہ ابّاجان ہی کے مکان میں رہتے ہیں۔ کیونکہ اب وہ مکان خالی پڑا ہے۔

نسیم! تم بے مروت ہو، اور کس قدر بے وفا ہو۔ میں تمہارے لئے گھنٹوں روتی رہتی ہوں تمہارے لئے میں نے وہ وہ تکلیفیں جھیلیں جن سے زیادہ کوئی عورت کوئی تکلیف نہیں جھیل سکتی ہیں نے اب تک تمہارا نام نہیں بتایا۔

جمیل نے اماں جان مرحومہ نے میرے شریک جرم کا نام طرح طرح کے طعنوں، طرح طرح کے غصے کے ساتھ پوچھا۔ مگر میں تمہارا نام کیسے بتاتی جمیل کہتا تھا کہ صرف اسے نام معلوم ہوجائے تو وہ اس شخص کا خون پی لے۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

چند مہینوں میں میری شادی ہوجائے گی۔ میرے گناہ کو دبا دیا گیا ہے۔ مگر مجھے اپنے ماں باپ کیسے واپس ملیں گے۔ اور میری وجہ سے بیچارے جمیل نے کیا کیا مصیبتیں برداشت کی ہیں۔ بس خدا حافظ۔ فقط

تمہاری زلیخا،،

میرے قلب نے پھر ملامت شروع کی۔ مگر تسکین یہ بھی ہوئی کہ معاملہ دب گیا۔ مگر پھر بھی میں اپنے شفیق چچا کی موت کا باعث ہوا تھا۔ میں نے اپنے قلب کو پھر تاسف، بدبختی اور بدنصیبی کا شکار محسوس کیا۔ یہاں تک کہ یوفت سی گیلری میں تتیاں کے شاہکاروں نے میری توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا۔

تیسری فضا

۵

بمبئی

نسیم

معاملہ جمیل کی عقلمندی کی وجہ سے دب چکا تھا۔ نہ چچا جان کو خبر تھی۔ اور نہ میرے ہونے والے شوہر یعنی تمہارے بھائی جان کو۔ چند مہینوں کے بعد میری شادی ہو گئی۔ اور میرا از کم سے کم اس وقت تک تو ظاہر نہ ہو سکا۔

تمہارے بھائی جان کلیم کو میں نے تم سے ہزار درجے بہتر پایا۔ اس کے سینے میں ایک سچا دل ہے۔ وہ ایک ضمیر کے مالک ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی قسم کے شک کا بھی مجھ پر اظہار نہیں کیا۔

میری طبیعت کی ساری تیزی، جس کو تم "زہر یلا پن" کہا کرتے تھے۔ اب ختم ہو چکی ہے میں کلیم کی دل و جان سے پرستش کرتی ہوں۔ اور تمہارے جیسے بے وفا اور غرض مند انسان کو بھی یاد نہیں کرتی۔

میں سچ کہتی ہوں۔ کہ کلیم سے جوں جوں میں تمہارا مقابلہ کرتی ہوں۔ مجھے تم سے نفرت ہوتی جاتی ہے۔

تمہاری واپسی کا زمانہ قریب آرہا ہے۔ مگر میں تمہارے سامنے آنا بھی گوارا نہ کروں گی یہ خط محض اس لئے لکھ رہی ہوں کہ تمہاری نسبت میرے دلی جذبات کا علم خود تم کو ہو جائے۔

زلیخا۔

طسوس

میں نے ایک طرح کا سکونِ قلب محسوس کیا۔ نتائج اس قدر خوفناک ثابت نہیں ہوئے میں نے بھی عہد کر لیا۔ کہ اب میں زلیخا سے کوئی واسطہ نہیں رکھوں گا۔ سلیمہ کی معصوم ہنستی ہوئی صورت میری نظروں کے سامنے پھرنے لگی۔ اور سلیمہ میری ہونے والی تھی۔ میں اس زمانے میں روم میں تھا یورپ کے سلیس میں تی تیان کی مشہور تصویر "پاک اور ناپاک محبت" میری نظروں کے سامنے تھی۔ میرا خیال یورپ کی دلربا فضا سے کچھ دیر کے لئے گریزاں ہو کر ہندوستان پہنچا۔ اور "ناپاک محبت" کا عکس مجھے زلیخا کی محبت میں اور "پاک محبت" کا عکس سلیمہ میں نظر آنے لگا۔

چوتھی فضا

۱

میں ہندوستان پہنچا

بمبئی میں زلیخا مجھ سے اجتناب کرتی رہی۔ میں محسوس کر رہا تھا۔ کہ ایک عظیم الشان خلیج اس کے اور میرے درمیان حائل ہو چکی ہے۔

ایک روز میں کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ بھائی جان میرے سرہانے کھڑے ہوئے میرے بالوں سے کھیل رہے تھے۔ میں نے ان کے ہاتھوں میں وہی چٹھی دیکھی جو میں نے زلیخا کو لکھی تھی میں مبہوت ہو گیا۔ کیا زلیخا نے سچ مچ پورے حالات بھائی جان سے کہہ دیئے تھے؟ مگر مجھے زلیخا کی طبیعت سے اور حالات کی اہمیت سے یقین تھا۔ کہ اس نے میرے خلاف بہت ہی باتیں کی ہوں گی۔ مگر ایک بلا واسطہ انداز سے اور ثبوت کے طور پر یہ چٹھی دی ہو گی لیکن پورے معاملے کی اہمیت کا خیال کرتے ہوئے اس چٹھی سے زیادہ کوئی بات بیان نہ کی ہو گی۔

وہ مجھ سے دُور رہنا چاہتی تھی۔ اس کی نخوت اس کو گوارا نہ کر سکتی تھی۔ کہ پھر میں اس سے مل سکوں۔ اور وہ اپنی زہریلی طبیعت کی رُو سے بھائی جان کو بھی مجھ سے دور کر لینا چاہتی تھی۔ اور اس لئے اس نے سب سے زیادہ خطرناک حربہ استعمال کیا تھا۔

لیکن بھائی جان نے کوئی خیال نہیں کیا۔ وہ اس معاملے کو ٹال گئے یا یہ کہ انہوں نے اس کو اہمیت نہیں دی۔ اور کبھی اس موضوع پر ان سے گفتگو نہیں ہوئی۔

مگر مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا۔ کہ زلیخا پوری طرح کوشاں ہے۔ کہ سلیمہ کی شادی مجھ سے نہ ہونے پائے۔ اور جمیل جواب انیس برس کا ہو گیا تھا۔ اور سلیمہ کے ساتھ تھا زلیخا کی پوری مخالفت کر رہا تھا۔ مجھ کو بعض اوقات تعجب ہونے لگا کہ جمیل جو بظاہر اس قدر لا پروا اور بے فکر نوجوان معلوم ہوتا تھا۔ اپنے پہلو میں اس قدر گداز، ہمدرد اور عاقبت اندیش دل رکھتا ہے زلیخا کی انتہائی مصیبت کے عالم میں اس نے انتہائی ہمدردی اور قربانی کے ساتھ زلیخا کو ہر طرح کی بدنامی سے حتی الامکان بچایا۔ اور خود دوسری مول لیتا رہا۔ زلیخا کی زہریلی طبیعت کی بدولت جمیل اور زلیخا میں اختلاف پیدا ہو چکا تھا۔

قصہ مختصر زلیخا کی سب کوششیں رکھی رہ گئیں۔ اور سلیمہ سے میری شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔

سلیمہ کو میں نے یورپ آنے کے بعد سے اب تک نہ دیکھا تھا جمیل کو دیکھ کر مجھے دلی مسرت ہوئی۔ اور وہ مجھ سے اس محبت سے ملا کہ میرا قلب انتہا درجہ متاثر ہوا۔ اگر اس لڑکے کو صرف شک بھی ہو جاتا۔ کہ اس کی بہن کو تباہ کرنے والا میں تھا۔ تو وہ اسی وقت

چوتھی فضا

جان پر کھیل کر میرا خون پی جاتا۔
لیکن قدرت کی نقاب اندازیاں۔
ہم جس دنیا میں رہتے ہیں۔وہ "کذب و افترا" دروغ و مصلحت کی تاریک نقابوں میں اس قدر چھپی ہوئی ہے۔کہ سچائی ہر ہر قدم پر تلاش میں ناکام ہو کر ٹھوکر کھاتی اور گرتی جاتی ہے۔

۲

شادی کے دن میں کچھ رہا تھا۔کہ جمیل بہت پریشان ہے! درد سر شام ہی وہ جا کر اپنی خوابگاہ میں لیٹ رہا اور کہلا بھیجا۔کہ سر میں درد کی شدت کے باعث وہ کھانا نہ کھا سکے گا۔

میں ہزاروں آرزوؤں کو اپنے دل میں لئے ہوئے حجلۂ عروسی میں داخل ہوا۔ مگر میں نقش حیرت بن کر وہیں کھڑا ہو گیا۔سلیمہ زار و قطار رو رہی تھی۔مجھے دیکھ کر اس نے منہ چھپا لیا۔ میں اس کی جانب بڑھا۔لیکن اس نے انتہائی دردناک آواز میں کہا"مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔۔۔۔ میں تمہارے قابل نہیں ہوں"۔

میری زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔میں حیرت کے جذبے کو اور زیادہ گہرا ہوتا پا رہا تھا۔یہاں تک کہ حیرت، رنج، غصہ اور بدبختی شدید ترین احساس میں تبدیل ہو گئی ایک لمحے تک میں اسی حالت میں بالکل مبہوت و مفلوج کھڑا رہا پھر خون کے شدید دوران نے

مجھ میں ایک خطرناک کیفیت پیدا کر دی۔ اور میں نے انتہائی غضبناک لہجے میں کہا "سلیمہ اگر خیریت چاہتی ہو۔ تو سچ سچ بیان کر دو"
اور میں ایک بے حس توجّہ کے ساتھ اس کے قصّے کو سن رہا تھا۔ اس سے بھی خاندان ہی کے ایک نوجوان نے یہی سلوک کیا تھا۔ جو میں نے زلیخا سے کیا تھا۔ سلیمہ کی قسمیں یقین دلا رہی تھیں۔ کہ خود اس کا قصور بہت کم تھا۔ اسے فریب سے گھیرے جال میں پھانسا گیا تھا۔ اور اب وہ بھی زلیخا کی طرح ایک بچے کی ماں بننے والی تھی۔
میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ مجھ سے فریب کیا گیا تھا۔ اور اس ستم ظریفی کے ساتھ۔ سلیمہ کی نوٹ بک جسے میں اپنے ساتھ لیتا ہوا آیا تھا میں نے نکال کر اس کے پاس پھینک دی۔ میں شدّت کرب سے کانپ رہا تھا وہ میرے قدموں سے لپٹ گئی۔
پھر ایک برفانی آہستگی کے ساتھ میرے قلب میں ردّ عمل شروع ہوا۔ مجھ سے بھی وہی کچھ کیا گیا۔ جو میں دوسروں سے کر چکا تھا۔ میں نے ایک پردہ نشین لڑکی کی زندگی برباد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ اب بہت دنوں کے بعد قدرت اپنی پوری ستم ظریفی کے ساتھ مجھ سے انتقام لے رہی تھی۔ میری ہونے والی بیوی کو بھی کسی نے اسی طرح تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اور کرب کا واقعی حصّہ مجھے مل رہا تھا۔
ایک وحشیانہ خیال میرے دماغ میں آیا۔ سلیمہ کو فوراً طلاق کیوں نہ دے دوں مگر پھر میری نگاہیں جھکیں۔ وہ میرے پیروں سے اسی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے گرم گرم آنسو اس کے رخساروں سے ڈھلک کر میرے پیروں پر گر رہے تھے۔

چوتھی فضا

پھر متضاد جذبات کے ایک شدید تصادم کے ساتھ میں اس کی طرف دیکھنے لگا یہ عورت جواب کسی اور کی ہو چکی ہے۔ جس کی ساری دلکشی میرے لئے فنا ہو چکی ہے۔ یہی قابلِ نفرت ہستی وہ معصوم، دلکش سلیمہ ہے۔ اس کے چہرے پر اب بھی معصومیت برس رہی ہے۔ آنسوؤں سے اس کا چہرہ اور زیادہ معصوم معلوم ہو رہا ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں میری طرف التجا کی پوری کوشش سے دیکھ رہی ہیں۔

وہی قدرت کی نقاب اندازیاں۔

یہی وہ سلیمہ تھی جس نے اپنی نوٹ بک میں وہ جملے میرے لئے لکھے تھے۔ میرے لئے . . . اور لکھتے وقت اس نے سچائی سے لکھے تھے۔ کیونکہ ان کے پردہ نشین حساس جذبات کو میلان کے لئے میرے سوا اور کوئی اس وقت تک نہ ملا تھا۔ پھر ایک شخص نے جو مجھ سے زیادہ عملی آدمی تھا۔ اس کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیا۔

پھر بھی قصور سلیمہ کا نہ تھا۔ میں نے زلیخا کو مجبور کر کے میرے حوالے کر دیا تھا۔ اور میرے ہی باعث دبے ہوئے شعلہ دم احساسات نے یکلخت بھڑک کر سلیمہ کو جلا دیا۔

یہ سب سہی مگر اب یہ عورت میری نہ تھی۔ یہ کسی دوسرے کی ہو چکی تھی۔

مگر اپنے گناہ کی پاداش میں اس پرائی عورت کو اپنی حفاظت میں لینا میرا فرض تھا۔ کوئی خوفناک حکومت کرنے والی آواز میرے قلب کی گہرائیوں سے مجھے حکم دے رہی تھی۔ کہ یہ تمہارے کئے کی بلا واسطہ سزا۔

ہندوستان سے جاتے وقت مجھے اس پادری کے وہ الفاظ یاد آگئے۔ اس نے حضرت

موسیٰ کا وہ قول مجھے سنایا تھا: "آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت خدا کا یہی قانون ہے۔"

کم سے کم اس وقت اپنی تمام عقلیت سے درگزر کر کے میں محسوس کرنے لگا کہ یہ قدرت کا انتقام ہے اور اب وہی آواز مجھے بے بس کر کے مجبور کرنے لگی اور اسی وری کا سنایا ہوا دوسرا جملہ یاد آگیا۔

"اور عفو و درگزر بہترین انتقام ہے۔"

معلوم نہیں کس طرح میری زبان نے ذہن کی طوفانی حالت میں یہ الفاظ کہے "خیر اب جو ہو چکا ہو چکا۔" میں نے اپنے لہجہ کی نرمی محسوس کی۔ اور اس کے بعد اپنے پیروں کو سلیمہ کی گرفت سے نکال کر میں باہر نکل گیا۔ دروازہ بند کرتے وقت سلیمہ کی ہچکیوں کی آواز برابر آ رہی تھی۔

۳

اسی کمرے میں جو ایک زمانے میں میرا اسٹڈیو رہ چکا تھا میں جا کر ایک کوچ پر لیٹ گیا اب تک میرا سارا جسم کانپ رہا تھا۔

کبھی میں ایک شدید طوفانی غصّہ محسوس کرتا۔ پھر وہ غصّہ یکلخت سرد ہو جاتا۔ درد کرب میں تبدیل ہو جاتا۔ کبھی میں ایک وحشیانہ خواہش محسوس کرتا۔ کہ جا کر اس شخص کا گلا دبا دوں جس نے میری زندگی کو ہمیشہ کے لئے بے لطف کر دیا تھا۔ پھر میں محسوس کرنے لگتا یہ وہی گناہ تو تھا جس کا اس سے پہلے میں مرتکب ہو چکا تھا۔ .

چوتھی قضا

مجھے جمیل سے نفرت معلوم ہونے لگی۔ اس نے مجھے ہمیشہ کے لئے ایک شیطانی کرب میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں سمجھنے لگا۔ کہ اس نے جو کچھ کیا۔ اگر اس کی جگہ میں ہوتا۔ تو میں بھی یہی کرتا؟ پھر میں دماغ کو تہ و بالا کر دینے والے سلسلۂ خیالات میں مضطرب ہو گیا۔ اور اسی قلبی اذیت کے عالم میں مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی۔

نرم آہٹ سے میری آنکھ کھلی۔ تاریکی میں کوئی خوفناک شکل مجھے اپنے نزدیک نظر آئی۔ میں اس کی صورت نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اس کی موجودگی سے میرا خون منجمد ہونے لگا۔ وہ شکل مجھ سے نزدیک ہوتی گئی۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ مگر پھر کمرے میں یکلخت روشنی پھیل گئی۔ اور میں نے اپنے قریب زلیخا کی خوفناک مسکراہٹ کو دیکھا۔

زلیخا میرے قریب کھڑی تھی۔ اس کے لبوں پہ مسرت کی ایک حقارت آمیز مسکراہٹ بھی

"کیوں آج کی رات آپ یہیں گزار رہے ہیں؟"

اس نے اپنی تیر بہ چبھتی ہوئی حقارت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ کر سوال کیا۔ ایک شدید کرب کا عالم مجھ پر طاری تھا۔ دنیا میری آنکھوں میں تیزی سے گردش کر رہی تھی۔ میں نے اپنے دل میں جذبات کا ایک شدید تلاطم محسوس کیا۔ میرے قلب و حواس بیکار ہو گئے۔ میں نے جھپٹ کر زلیخا کو اپنے آغوش میں گھسیٹنے کی کوشش کی۔ وہ ہٹ کر دور کھڑی ہو گئی۔ اور غصے سے اس کے تنفس کی روانی بڑھ گئی۔ اور اس نے زور سے کہا۔

"خبردار اگر اس قسم کی کوئی اور حرکت کی تو یاد رکھو گے"۔ اور اس کے بعد وہ کہنے لگی "اب بھی تم میں اتنی جرأت ہے۔ اتنی بے شرمی ہے۔ کہ تم مجھ سے آنکھیں چار کر سکتے ہو۔ تم نے ایک

پردہ نشین لڑکی کے احساسات کو برانگیختہ کر کے اسے اپنی ہوس پر قربان کر دیا تم نے میری زندگی تقریباً برباد کر دی۔ تمہاری وجہ سے میرے ماں باپ مجھ سے ہمیشہ کے لئے چھوٹ گئے تم اصل میں تم ہی میرے ماں باپ کے قاتل ہو۔"

اس کے لہجے میں رقّت کا اثر نمایاں ہونے لگا۔ پھر وہ لمحے کے بعد اسی تمکنت، اسی نخوت کے ساتھ اس نے کہنا شروع کیا" وہ زمانہ دوسرا تھا۔ پردے کی وجہ سے میرے جذبات اس قدر نازک ہو گئے تھے کہ میں حتی الامکان مقابلہ کر کے لاچار ہو گئی۔ اب سلیمہ کی اس حالت کے بعد مجھے یقین آیا کہ قصور میرا نہیں تھا۔ تمہارا تھا۔ تمہاری طرح ہر بدمعاش شریف پردہ نشین لڑکیوں کی آبرو ریزی کر سکتا ہے۔"

پھر ایک زہر خند کے ساتھ اس نے کہا "اور دیکھو اب خدا تم سے، انتقام لے رہا ہے جب میں اس مصیبت میں مبتلا تھی۔ تو میں خدا کو کوستی تھی۔ کہ اس نے سارا خمیازہ، ساری مصیبت میرے ہی لئے رکھی۔ مگر اب مجھے یقین آیا کہ خدا کی چکی آہستہ پیستی ہے۔ مگر بہت باریک پیستی ہے میری زندگی آرام سے گزر رہی ہے۔ اور تمہاری زندگی انشاء اللہ ہمیشہ جہنم ہی رہے گی۔

مجھے اپنے پرانے تخیلات، مہیب انداز سے پھر یاد آنے لگے۔ زلیخا اس وقت لیڈی میک بیتھ اور کلیوپیٹرا سے ہزار گنی زیادہ افعی طبیعت معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے انتقام کے لئے کیسے موقعے کو انتخاب کیا۔ اس کا زبانی انتقام مجھے قدرت کے حقیقی انتقام سے زیادہ وحشت ناک معلوم ہو رہا تھا۔

"میں تمہیں خدا کے اس انتقام پر مبارکباد دینے آئی تھی۔ اب خدا حافظ۔ اور ہمیشہ

کے لئے تم پر خدا کی لعنت۔"
اس نے روشنی بند کی اور تاریکی میں ایک پریت کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی۔

۴

اس کے جانے کے بعد نصف گھنٹے تک حبس وحشت میں، اور خیالات کے حبس
تہ و بالا کرنے والے تصادم میں میرے دل و دماغ مصروف رہے اس کا خیال ہی ہمیشہ مجھے
خوفزدہ کر دینے کے لئے کافی ہے۔
اپنی ساری زندگی میں ایسی مہیب کیفیت میں نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔

۵

لیکن نصف گھنٹہ کے بعد اس ناقابلِ برداشت دماغی کیفیت سے نجات پانے
کے لئے میں اٹھا۔ اور کمرے میں روشنی کر دی تیز سفید روشنی ہر چیز پر چھا رہی تھی۔ اور پھر میں
اپنے آپ کو زندہ اور باحواس فضا میں پانے لگا۔ میں نے کھڑکیاں کھول دیں اور سمندر
سے ٹھنڈی، تسلی دینے والی ہوا کا ایک جھونکا آ کر تسکین دے گیا۔
پھر نہ معلوم کیا سمجھ کر اپنی اس گھبراہٹ، اس پریشانی کو رفع کرنے کے لئے میں
نے ایک خواہش محسوس کی کہ کہیں چلا جاؤں کسی سے باتیں کرنے لگوں۔ کمرے کے
دروازے کے باہر سے جھانک کر میں نے دیکھا جمیل کے کمرے میں روشنی معلوم ہو رہی تھی

میں ایک مستقل ارادے کے ساتھ قدم اٹھاتا ہوا جمیل کے کمرے کے پاس تک پہنچ گیا۔ ایک خفیف سے دھکے سے بلا کسی آواز کے دروازہ کھل گیا جمیل دروازے کی طرف پشت کئے ایک میز پر بیٹھا کچھ کھور رہا تھا۔ اور اس کے قریب ایک گلاس میں کوئی سیال چیز رکھی ہوئی تھی جس کو دیکھ کر فوراً خیال میرے ذہن میں بجلی کی طرح کوندگیا۔ کہ یہ کوئی زہر ہے۔

میں نے ایک آواز کے ساتھ زور سے دروازہ بند کیا جمیل یکلخت چونک پڑا۔ اور اٹھ کر دیکھنے لگا معلوم ہوتا تھا۔ کہ آج اس کی عمر میں کئی سال کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ پیر میں ایک خفیف سا رعشہ تھا۔

میں تیزی سے اس کے پاس پہنچا۔ وہ کھوئی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اس طرح خلافِ توقع اور بروقت میرے آجانے سے اس کی ساری قوتِ ارادی ختم ہو چکی تھی۔ میں نے اس گلاس کو ہاتھ میں لے لیا۔ روشنی میں سیال زہر چمک رہا تھا میں جمیل کی طرف استفہامی نظر سے دیکھ رہا تھا اس کے چہرے کا رنگ بالکل اڑ گیا۔ اور وہ بے قابو ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

" تم نے ابھی تک ایک قطرہ بھی پیا تو نہیں ؟ "

اس نے جواب میں سر ہلایا۔ اس کے شدید جذبات اس کے دماغ کو بالکل معطل کئے ہوئے تھے میں نے اس گلاس کو ایک اگالدان میں انڈیل دیا۔ پھر خالی گلاس کھڑکی کے نیچے پھینک دیا۔ جمیل نے ایک خفیف سی حرکت کی تھی۔ کہ گلاس میرے ہاتھ سے لے گر وہ پھر اسی طرح بیٹھا رہا۔ اس کی کیفیت یاس و الم کو دیکھ کر میں اپنی دماغی کیفیت بالکل بھول گیا۔

چوتھی فضا

سنگار کے میز پر ونکارنس کا شیشہ رکھا تھا۔ اس وقت کوئی اور مقوی چیز ملنا مشکل تھی میں نے ایک اور گلاس اٹھا کر اس میں سے کچھ ونکارنس جمیل کو پلائی جس سے اس کے ہوش و حواس فرا درست ہونا شروع ہوئے۔

جمیل نے اپنے آپ پر قابو حاصل کرنے کے بعد محبت بھری آواز میں مجھ سے کہا "نسیم مجھے اس بدنصیبی کی اطلاع شادی سے صرف چند گھنٹے پہلے ہوئی اور کوئی تدبیر نہیں کی جا سکتی تھی ورنہ کم از کم میں تم کو اس طرح مصیبت میں پھنسنے نہ دیتا۔ مگر میری خود غرضی میرا فرض تھی۔

میں جمیل کے قریب ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ میرا دماغ اب پورے سکون کے ساتھ کام کر رہا تھا میں نے تسلی بخش لہجے میں کہا "جمیل میں تم کو ذرا بھی الزام نہیں دیتا۔ تمہاری جگہ ہر شخص مجبور ہو جاتا۔"

جمیل کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے گرنے لگے۔ زلیخا کے بعد سلیمہ کی اسی حالت اور اسی بپتی نے اس کی قلبی تکلیف کو ناقابل برداشت بنا دیا تھا۔ زلیخا کا معاملہ تھا اس نے پوری مستعدی سے دبا اور اپنی ہوشیاری سے اپنے ناموس اور خاندان کی عزت کو بال بال بچا لیا۔ مگر یہ دوسرا ستم ظریفانہ وار سلیمہ نے بھی خاندانی عزت اور شرافت کو اس قدر فراموش کر دیا۔

وہ مجھ سے کہنے لگا "پہلے میرا ارادہ یہ ہوا کہ میں سلیمہ کا گلا گھونٹ دوں یا اسے قتل کر کے پھر اپنی جان اپنے ہاتھوں سے لے لوں۔ مگر مجھے اس کو قتل کر دینے کی ہمت نہ ہو سکی۔ اس مرتبہ رسوائی یقینی تھی جس طرح کہ پہلے ابا جان نے خودکشی کی تھی۔ اب میں نے بھی خودکشی کا ارادہ کر لیا۔"

اس کی زبان سے بے اختیار چچا جان کی خودکشی کا ذکر نکل گیا۔ فوراً اس کو احساس ہوا اور میرے چہرے پر استعجاب کا کوئی اثر نہ دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔

میں نے اب عملی طور پر اس تمام قصے کو ختم کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ اور مستقل غمزدہ آواز میں اس سے کہنا شروع کیا "جمیل بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک چیز کا دوسری چیز سے کوئی تعلق نہیں کم از کم عقل اس کو تسلیم نہیں کرتی"۔ وہ میری طرف استفہامی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

میں نے اور زیادہ وضاحت سے کہنا شروع کیا "ممکن ہے عقل اس بات کو تسلیم نہ کرے کہ جو دوسروں کے ساتھ برائی کرتا ہے اس کا خمیازہ بالکل غیر متوقع طور پر جداگانہ ذرائع بھگتتا ہے مگر یہ میرا ذاتی تجربہ ہے"۔ اس نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔

میں نے کرسی اس کے قریب گھسیٹ لی اور تمہید کی طوالت سے عاجز آ کر براہ راست اس سے اصل معاملہ بیان کر دینے کا ارادہ کر کے کہا "سنو جمیل آج میں تم سے وہ راز بیان کئے دیتا ہوں جس کے سننے کے بعد تم سب سے زیادہ مجھ سے نفرت کرنے لگو گے"۔

جمیل کی حیرت اب اس کے اختیار سے باہر تھی۔ اس نے بیتابی سے کہا "کیا؟"

"تم کو معلوم ہے۔ کہ زلیخا کو کس نے اپنی ہوس پر قربان کیا جمیل، وہ میں ہی تھا۔ ۔ ۔"

میں یہ الفاظ کہہ گیا۔ اس طرح جیسے کوئی خواب میں باتیں کر رہا ہو۔ جمیل اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب بھی اس کے غصے پر حیرت غالب تھی۔ "نسیم ۔ ۔ ۔ ۔ تم ۔ ۔ ۔ تم ۔ ۔ ۔"

"ہاں میں، وہ میں ہی تھا جس نے اس خاندان کو گوناگوں مصائب میں مبتلا کیا جس کی بدولت تمہارے شمس الدین کی زندگی تمام ہوئی جس کی بدولت تم نے انتہائی کرب میں زلیخا کے ساتھ اپنے

مہینے گزارے جس کی بدولت خود زلیخا کو وہ مصیبتیں، وہ قلبی اذیتیں برداشت کرنا پڑیں جو ایک عورت کا دماغ خراب کر دینے کے لئے کافی ہیں۔۔۔۔ ان تمام چیزوں کا ذمہ دار میں تھا۔۔۔۔ اور سلیمہ کا گناہ میرے لئے قدرت کا انتقام ہے"

خود میری آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ڈھلک رہے تھے جمیل کا غصہ دب گیا تھا! وہ بچوں کی طرح میز پر سر رکھے زار و قطار رو رہا تھا مگر پھر ایک کوشش کے ساتھ اپنی قوتِ ارادی پر قابو حاصل کر کے میں نے کہا "جمیل اگر تم کچھ اور سن سکتے ہو تو سنو" یہ کام کرنے کا وقت ہے" جمیل میری طرف سر اٹھا کر دیکھنے لگا۔ میں پھر کہنے لگا "گناہ ایک شخص اپنی مسرت کے لئے کرتا ہے اور دوسرے اس کا خمیازہ بھگتتے ہیں۔ زلیخا، سلیمہ اور میرے گناہ کا خمیازہ صرف ہم کو نہیں بھگتنا پڑا، چچا جان مرحوم، چچی مرحومہ اور تم بھی قلبی اذیت اور کوفت میں برابر کے شریک رہے یہاں تک کہ ان پیہم صدمات اس مہیب حالات کے اعادے سے بالکل مجبور ہو کر تم نے آج اپنی زندگی ختم کر لینے کا ارادہ ہی کر لیا تھا"

پھر جمیل کی طرف دیکھ کر میں نے کہا "اور اس کا باعث۔ اس تمام مصیبت اور بدبختی کا باعث وہ لڑکیاں نہیں ہیں۔ دوسرے نے ان کو مردوں کی صحبت اور مردوں کے ساتھ اس قدر بے خبر بنا رکھا ہے کہ ہر دام فریب میں ان کا پھنس جانا یقینی ہے۔ دبے رہنے کی وجہ سے ان کے احساسات نازک تر ہو جاتے ہیں اور وہ مجبور ہو جاتی ہیں"

جمیل میری طرف عجیب و غریب نظروں سے دیکھ رہا تھا اس کی قوتِ عمل سلب ہو چکی تھی۔ میں نے کہنا شروع کیا "تم نے پہلے جس ہوشمندی سے سارے معاملے کو دبا دیا ہمت کر کے اب پھر اس کے لئے تیار ہو جاؤ۔ سلیمہ کو ایک سال کے لئے انگلنڈ لے جاؤ اور قسمت کے سامنے اگر کچھ زور نہیں چل سکتا تو کم سے کم رسوائی سے تو بچے ہو"

ہوس

میں نے جمیل کے ایک شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ جمیل یہ ہماری معاشرت ہے۔ جو ہمارے نزدیک اس رسوائی اس بدنامی کی اتنی اہمیت ہے۔ اس بدنامی سے بچانے کے لئے جو تدبیریں کی جاتی ہیں۔ مثلاً پردہ وغیرہ ان سے نتیجہ الٹا نکلتا ہے کاش ہماری عورتوں کو پردہ کا صحیح مفہوم اور عصمت مآبی کی تعلیم دی جائے۔

مگر جمیل کا دماغ اس وقت کسی معاشرتی لکچر کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں نے دلنشیں پیرائے میں اسے سمجھانا شروع کیا کہ وہ سلیمہ کو ایڈمنسٹرلے جائے۔ اور یہ راز جن چند لوگوں کو معلوم ہے۔ ان کے سوا کسی اور کو معلوم نہ ہونے پائے۔ اور جب بچہ پیدا ہو تو اسے بہت دور بھجوا دیا جائے یا کسی کو دیدیا جائے۔ اور پورا معاملہ بالکل دبا دیا جائے۔

قدرت کی نقاب اندازیوں کی طرح، انسانوں کو بھی دروغ بافیوں اور نقاب اندازیوں کی ضرورت لاحق رہتی ہے۔

۶

پورا ایک سال میں نے تنہائی میں گزارا۔ اس اثنا میں ریلوے کے محکمہ تشہیر میں مجھے ملازمت مل گئی تھی جس کی وجہ سے خانگی اذیتوں سے دھیان بٹا رہتا۔ مگر پھر بھی ہمیشہ کے لئے اپنی زندگی کے خاک میں مل جانے کا خیال ہی کتنا روح فرسا تھا۔

ایک دن تنہائی میں میں نے غور کرنا شروع کیا۔

مجرمین کی فہرست یہ تھی۔ میں اور زلیخا۔ سلیمہ اور وہ شخص۔

اور سزا پانے والے؟ — کیا قدرت کا انصاف یہی تھا۔ خیر مجھے جو سزا ملی میں اس کا حقدار تھا۔ میں نے ایک بن بیاہی لڑکی کی زندگی کو آلودہ عصیاں کیا۔ اور اس کے جواب میں

چوتھی قضا

مجھے ایسی بیوی ملی جو پہلے دوسرے کی ہو چکی تھی۔

زلیخا اور سلیمہ کے لئے یہ قلبی اذیتیں کیا کم روح فرسا تھیں اپنی شرم و ذلت۔ کے راز چھپانے کی کوشش قلبی اضطراب، ذہنی کشمکش جسمانی تکلیفیں، پھر بچے کا چھن جانا خیر یہاں تک تو قدرت کی سزائیں حق بجانب تھیں۔

مگر جمیل نے کیا گناہ کیا تھا وہ ہنسنے بولنے والا بے فکر، بے پرواہ کا ٹینس کا کھلاڑی اور ہر چیز سے مستغنی۔ ... اس ہنستی بولتی ہوئی بے فکری سے اپنی، اپنی بہنوں کی، اپنے خاندان کی ناموس بچانے کے لئے اس کی قلبی اور ذہنی تکلیفیں، قدرت کس حد تک اس کو یہ سزا دینے میں حق بجانب تھی۔

پھر چچا جان اور چچی جان کی انتہائی قلبی تکلیف جو ان کی موت کا باعث بنی۔

ایک شخص گناہ کرتا ہے۔ اور ہزاروں اس کا خمیازہ بھگتتے ہیں۔

مگر ان سب کا باعث کیا تھا؟ معاشرت کی خامیاں تعلیم تو دی جانے لگی۔ مگر آزادی کا پتہ نہیں۔ لڑکیوں کے جذبات تیز تر ہوتے گئے۔ ان کے گناہ کو گناہ کہنا بھی ظلم ہے۔

فرض کیجئے کہ وہ بے پردہ لڑکیاں ہوتیں تو حالات اس قدر خوفناک صورت اختیار نہ کرنے پاتے چچا جان اور چچی جان اتنا گہرا اثر نہ لیتے۔ اور ان کی زندگی خاک میں نہ ملتی۔

جمیل اتنا گہرا اثر نہ لیتا۔ اور اس کی بے فکری اور لاپرائی اس طرح ختم نہ ہوتی۔

کوشش اس کی کی جاتی ہے۔ کہ گناہ سے بچایا جائے۔ اور نتیجہ نکلتا ہے۔ گناہ اور اس کے تلخ ترین نتائج۔

سلیمہ آگئی۔ وہ گھر میں رہتی تھی۔ اس کا بچہ اس سے چھن چکا تھا۔ اور نہ مجھے نہ اس کو نہ جمیل کو معلوم تھا کہ اب وہ کہاں ہے۔

مگر سلیمہ اب کسی اور کی ہو چکی تھی۔ میرے لئے وہ کوئی نہ تھی جس کی ہستی میرے لئے نہیں بنائی گئی تھی۔ مہینوں تک مجھ سے اور اس سے بات چیت بھی نہیں ہوئی اکثر میں اس کی سسکیوں کی آواز سنتا اور میرے سر میں درد ہونے لگتا۔

مہینے گزرتے گئے۔ میں اپنے کو مجرم اور الزام سمجھتا رہتا۔ مگر اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ میں نے اس کی طرف کبھی التفات کی نظر سے نہیں دیکھا۔

ایک دن کسی کام سے میں اس سے کوئی بات پوچھنے گیا۔ وہ نہا کر ویسے ہی آئی تھی۔ اس کا جسم ایک بٹے تولئے میں لپٹا ہوا تھا۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ میں اس کمرے میں گیا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر سر سے پاؤں تک کانپنے لگی۔ مجھے یقین تھا کہ میرے چہرے پر التفات کی ایک جھلک بھی نہ تھی۔ پھر بھی خلافِ معمول مجھے اپنے قریب پا کر وہ بے قابو ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اور ہچکیاں لے لے کر وہ دوزانو ہو کر اس نے میرے پیر پکڑ لئے "خدا کے لئے میرا قصور معاف کر دو۔ میں تمہاری لونڈی بن کے رہوں گی۔"

میں نے اس کے دونوں شانوں کو سہارا دے کر اسے اٹھا لیا.... اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ مگر اس عالم میں بھی کوئی اگر میرے چہرے کو دیکھتا تو مجھے بالکل بے حس پاتا۔

ہم میاں بیوی کی طرح رہتے ہیں۔ مگر پھر بھی کوئی چیز ہے جس کو میں درمیان میں حائل پاتا ہوں۔ کچھ بھی ہو سلیمہ بالکل میری سلیمہ نہیں۔ حالانکہ وہ اپنی ہستی اپنے وجود تک کو میری

چوتھی فضا

خدمت، میری امت کے لئے مٹا دینے میں کوشاں رہتی ہے۔

سیمے اور کسی عورت سے محبت نہیں ہوتی۔ مجھے اپنی بیوی سلیمہ سے بھی محبت نہیں۔ محبت کو میں اب اپنی تصویروں میں ڈھونڈھتا ہوں۔ اور تصویروں ہی میں محبت کے تخیل کو کمال تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں۔

بھائی جان اور زلیخا آرام سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بینجری کی وجہ سے بھائی جان اس قلبی اذیت کا شکار نہیں جس میں میں مبتلا ہوں۔ میں اپنی سزا کا سزاوار بھی تھا۔ اور بھائیجان تو بالکل بے گناہ ہے۔ بینجری ان کے لئے نعمت بنی رہی۔ اور کچھ عرصے کے بعد جب بھائی جان کے وہ ایک بچے مر لیں گے۔ اور یہ باتیں پرانی ہو جائیں گی۔ اور ایک زیادہ آزاد، زیادہ تعلیم یافتہ نسل ہم لوگوں کی جگہ لے لے گی۔ تو میری داستان پڑھ کر بھائی جان کو بہت زیادہ قلبی تکلیف نہ ہو گی۔

مگر کم سے کم اس کا یہ نتیجہ تو ہو گا۔ کہ وہ اپنے گھر کی معاشرتی فضا کو زیادہ آزاد بنا دیں گے۔ اور آنے والی نسل ہم لوگوں کی طرح ان پے در پے مصائب کا شکار نہ ہو گی۔

جمیل انگلستان میں ہے۔ پھر اسی بے فکری سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کے خطوط اکثر آتے رہتے ہیں۔

....بدتر از گناہ

۱۹۳۱ء کا ذکر ہے۔ میں جامعہ عثمانیہ میں بی۔اے کے ابتدائی سال میں تھا۔ شترمنزل میں، جو اس زمانے میں جامعہ عثمانیہ کے چاروں اقامت خانوں (ہاسٹلوں) میں سب سے زیادہ بارونق تھا سوشل گیدرنگ کے سلسلے میں ایک ڈرامہ کی ضرورت ہوئی۔ چھوٹے سے مزاحیہ فیچر کی۔ میں نے ایک چھوٹا سا فیچر لکھا جو بہت پسند کیا گیا۔ اس طرح میں نے تصنیف و تالیف کی ابتدا کی۔

اسی سال سرما میں جب یومِ کلّیہ (کالج ڈے) منایا جانے لگا تو صدرِ انجمن اتحاد (کالج یونین) نے مجھ سے ایک ڈرامہ کی فرمائش کی۔ میں نے ایک ڈرامہ لکھ مارا جس کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ اداکاروں نے مغربی فلموں کی اداکاری کی نقل کی نہ کہ پارسی تھیٹریکل کمپنیوں اور ہندوستانی فلموں کی اداکاری کی۔ اس ڈرامہ کو حیدرآباد میں بہت

پسند کیا گیا اور مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس بھی ہوتا ہے اور ہنسی بھی آتی ہے کہ جتنی شہرت مجھے اس طالب علمی کے زمانے میں نصیب ہوئی، ابھی تک میسر نہ آ سکی۔

معلوم نہیں کون سی اندرونی طاقت تھی جو مجھ سے کہتی تھی تمہارا اصلی میدان ڈرامہ نہیں ناول ہے۔ تھرڈ ایر کے ختم پر جب گرما کی چھٹیاں آئیں اور میں چھٹیاں گزارنے عثمان آباد گیا تو وہاں میں نے "ہوس" لکھا جو میرا پہلا ناول ہے۔ اس زمانے میں مجھے ناولوں کے پڑھنے کا شوق بھی بہت تھا۔ اور خصوصیت سے میں ترگنیف دوماخورد، آلفرے دِمہ سے اور ایسے دوسرے انیسویں صدی کے روسی اور فرانسیسی رومان نگاروں سے متاثر تھا جو محبت کے جذبے کو اس طرح بیان کرتے ہیں گویا وہ ایک طرح کا "جبر" ہے اور افراد، خصوصاً عورتوں کے اختیار سے باہر۔ اسی عشقیہ یا جنسی جبر کے جراثیم آپ کو اس نیم پختہ ناول "ہوس" میں نظر آئیں گے۔ اس زمانے میں کنوٹ ہامزون کی نفسیات نگاری سے بھی میں بہت متاثر تھا، اور خصوصاً "بھوک" کی ہیئت اور تکنیک کا مجھ پہ بہت اثر تھا۔ ہوس میں جتنی بھی نام نہاد نفسیات نگاری ہے وہ کنوٹ ہامزون کی جھوٹی نقل ہے۔

"ہوس" بڑی حد تک "زمانہ جاہلیت" کے آثار سے بھری پڑی ہے۔ شروع کے حصے میں تفصیلات بہت ہلکی ہیں۔ زندگی کے زیادہ تر روشندان بند ہیں۔ اور عنفوانِ شباب کی مستی جنسیت کے علاوہ کوئی خاص داخلی روشن دان بھی نہیں کھل سکا ہے۔ پھر ہیئت کی حد تک یہ کہ پہلے دو حصوں میں جیسی کچھ نفسیاتی اٹھان

ہو رہی تھی، وہ آخری دو حصوں میں کچّی دیوار کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ اس کی کئی وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں جذبات کی "خیالی سیرابی" بہت زیادہ ہے نہ ہیرو کی کامیابی میں کوئی خاص اقصیت ہے۔ نہ اس انتقام میں جو منتقمِ حقیقی کے ہاتھوں اسے بھگتنا پڑتا ہے۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ آخر میں ناول بہت پھس پھسا ہو کر رہ گیا ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب سالِ چہارم (بی اے کے آخری سال) سے پڑھانا شروع کرتے تھے۔ اس سے پہلے کی جماعتیں زیادہ تر ڈاکٹر محی الدین زور اور عبدالقادر سروری کی شاگردی ہی میں جتنی اردو سیکھ سکتیں سیکھ لیتی تھیں۔ مولوی عبدالحق صاحب کی کلاسیں بہت دلچسپ ہوتی تھیں۔ اور ان کا محلِّ وقوع اور ماحول بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہوتا تھا۔ اس زمانے میں جامعۂ عثمانیہ کے لئے وہ عالی شان عمارتیں نہیں بنی تھیں، جن میں ہم میں سے بہت سے علم کا چراغ جلا کے اس آندھی کے زمانے میں دوسروں کے حوالے کر آئے۔ کرائے کے بہت سے مکان تھے لیاقت منزل، آغا منزل اور معلوم نہیں کون کون سی منزل جہاں مختلف قسم کی کلاسیں ہوا کرتی تھیں لیکن مولوی عبدالحق صاحب ان میں سے کسی "منزل" میں نہیں پڑھاتے تھے۔ باغِ عامہ (پبلک گارڈن) سامنے ہی تھا، اور اسی میں سبزے کے فرش پر کھلے ہوئے آسمان کے نیچے اردو کی کلاسیں ہوتی تھیں۔

انہیں کلاسوں کے بعد ہم لوگ دیر تک مولوی صاحب سے ادھر ادھر کی (لیکن زیادہ تر علمی یا ادبی) باتیں کرتے رہتے تھے۔ مولوی صاحب کو اپنے طالب علموں کی

تعلیم ہی کی نہیں ان کے مستقبل کی بھی فکر رہتی تھی۔ اور اس زمانے میں جبکہ حیدرآباد میں اقربا نوازی اور احباب پروری ہی کے لئے نظم و نسق قائم تھا، مولوی صاحب نے اپنے ذاتی اثر اور رسوخ سے اپنے بہت سے شاگردوں کو آگے بڑھایا، جو اگر ان کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو شاید ساری عمر ٹھوکریں کھاتے رہتے۔ اس کے علاوہ ہم سب کو مولوی صاحب کی شاگردی پر اس لئے فخر تھا کہ آج کی طرح اس زمانے میں بھی مولوی عبدالحق اور اردو ہم نام الفاظ تھے۔ اس زمانے میں مولوی صاحب شہر سے بہت دور پنجارہ ہل پر رہا کرتے تھے جو آج تو حیدرآباد کی سب سے فیشن ایبل کالونی ہے لیکن اس زمانہ میں ان تمام پہاڑیوں پر ایک ہی مکان تھا جس میں مولوی صاحب پرانے مسودوں پر تحقیق کرتے رہتے تھے۔ اور مولوی صاحب کے بے تکلف دوست انہیں "شیخ الجبل" کہا کرتے تھے۔

غرض مولوی صاحب کو میں نے "ہوس" پڑھنے کے لئے دیا۔ دو تین ہفتے تک تو نہیں پڑھنے کی فرصت ہی نہیں ہوئی لیکن اس کے بعد اورنگ آباد جاتے ہوئے ٹرین میں انہوں نے پورا ناول پڑھ ڈالا، جب واپس آئے تو اس کی بہت تعریف کی میری فرمائش پر اس کا دیباچہ بھی لکھا۔ اور اس میں اس کے اصلاحی عنصر یعنی پردے کی مخالفت کو کافی سراہا۔ حیدرآباد پردے کے معاملے میں اس تبغیر میں سب سے زیادہ قدامت پسند رہا ہے۔ اور اس کے علاوہ دو رہی اصلاح پسندی کا تھا۔ پہلی "ترقی پسند" کتاب ابھی ابھی شائع اور ضبط ہوئی تھی۔ اس کا نام "انگارے" تھا۔

بدتر از گناہ

"ہوس" کی ہمت افزائی ہوئی تو لکھنے کا چسکا پڑ گیا۔ اور چند ہی ماہ کے عرصے میں میں نے "مرمر اور خون" لکھی جسے میں اپنا بدترین ناول سمجھتا ہوں۔ اب سے چند سال پہلے جب "سستا پیسہ" پڑھنے اور پھر اپنے "ہم وحشی ہیں" ریڈیو پہ پڑھنے سے پہلے کرشن چندر اس قدر ناراض نہیں تھے انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ "مرمر اور خون" کی بکری بند کر دی جائے اور ناشر نے جو کچھ خرچ کیا ہے وہ میں انہیں ادا کر دوں میرے خیال میں کرشن چندر کی یہ رائے غلط نہیں تھی لیکن تمام سستی دلچسپی پیدا کرنے والی کتابوں کی طرح وہ بہت جلد بک گئی۔ عام طور پہ "مرمر اور خون" پسند نہیں کی گئی۔ سب ہی نے اس کی برائی کی۔ اس کی مداح صرف ایک صاحبہ ہیں۔ جو خود بہت معروف مصنفہ ہیں، مس قرۃ العین حیدر، انہیں میرا یہ ناول میرے اور تمام ناولوں کے مقابل زیادہ پسند ہے معلوم نہیں کیوں؟

اس ناول یعنی "مرمر اور خون" کا زندگی سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ یہ آرٹ اور خصوصاً "نشاۃ ثانیہ کی بت تراشی" پہ بہت سی کتابوں، اور ہیولاک ایلس کی "نفسیاتِ جنسی" کا ابال ہے جس نے ایک قطعاً فرضی، ناممکن سے افسانے کی شکل اختیار کی ہے "فاؤسٹ" والے باب کی علتِ پیدائش یہ ہے کہ ہم نے اپنے سالِ چہارم کے زمانے میں اڈورڈ گارڈن کریگ کی تکنیک، (جتنی کچھ ہماری سمجھ میں آسکی) کے مطابق یہ ڈرامہ یا اس کا خلاصہ اسٹیج کیا تھا۔ لیکن "مرمر اور خون" کے تمام کردار بدقسمتی سے محض احتیاطاً یا رسمی طور پہ نہیں بلکہ واقعی طور پہ فرضی اور پروردہ تخیل ہیں۔ یہ حماقت میں نے

ملبوس

اس کے بعد ہر افسانے اور ناول کے ہر کردار کا اصل اس دنیا میں یا تو موجود رہ چکا ہے یا موجود ہے۔ اور ہر پلاٹ ریلاٹ سے مجھے ہمیشہ تلخی رہی۔ میرا مطلب ہے قصہ یا واقعہ، زندگی سے اخذ کیا گیا۔ اور قطع و برید بہت ہی کم کر دی گئی۔ تقریباً بالکل نہیں۔

اس قسم کے فرضی ناول کا خیال مجھے گاتیر کی "مدموزل دموپاں" کو پڑھ کے آیا تھا۔ اور فاؤسٹ والے منظر کو استعمال کرنے کا محرک بھی غالباً یہی ناول تھا۔

اخلاقاً مولوی عبدالحق صاحب نے اس ناول پر بھی دیباچہ لکھ دیا۔

کچھ دنوں بعد میں ولایت چلا گیا۔ وہاں تین سال میں بڑی حد تک اردو تحریر کا گُر بھول گیا۔ آنے کے کچھ دن بعد گریز کے ابتدائی دو تین باب لکھے۔ یہ ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے۔ پھر ایک آدھ سال کے بعد کچھ باب اور لکھے۔ لیکن اطمینان نہیں ہوا۔ اور یہ ناول یوں ہی پڑا رہا میں رہا۔ دوسرے ادبی کاموں میں مصروف تھا جو میرے خیال میں ادبی تصنیفوں سے کہیں زیادہ اہم تھے۔ مثلاً الحسن کے "معیارِ اعظم"، ارسطو کی "فنِ شاعری" اور دانتے کے "طربیۂ خداوندی" کے اردو ترجمے۔ مجھے قرونِ وسطیٰ کے یورپی ادب سے دلچسپی تھی۔ زیادہ تر وقت تحقیق میں گزرتا تھا۔ "گریز" کے چند ابتدائی ابواب جو لکھے جا چکے تھے یوں ہی پڑے سڑتے رہے۔

۱۹۴۲ء کے اوائل میں، بلا میری کسی قسم کی خواہش یا درخواست کے ایک دم سے فرمانِ خداوندی نازل ہوا۔ معلوم نہیں میرے کس جرم کی پاداش میں۔ اور

بدتر از گناہ

مجھے جامعۂ عثمانیہ کو چھوڑ کر جس سے میں ۱۹۲۸ء سے اب تک پہلے بحیثیت طالب علم پھر بحیثیت استاد وابستہ رہا۔ اب مجھے دربار میں چار سال شہزادی دُرِ شہوار کے سکریٹری کے حیثیت سے گزارنے پڑے۔ قرونِ وسطیٰ پر جو تحقیق ہو رہی تھی وہ عارضی طور پر جاں بحق تسلیم ہوئی۔ وقت بہت تھا۔ اس لئے کہ کتب خانے محل سے دور تھے، جہاں مجھے صبح کے نو بجے سے رات کے نو بجے تک وقت گزارنا پڑا۔ اور سال بھر میں آٹھ مہینے حیدرآباد کے باہر سفر میں گزرتے۔ سال میں چھ مہینے کشمیر میں اور دو مہینے بمبئی میں جنگ کا زمانہ تھا ورنہ معمولی پروگرام تو سال بھر میں یورپ کے ایک سفر کا ہو اکرتا تھا۔ خیر کشمیر کے پہلے سفر میں لاہور کے ریلوے بک سٹال سے میں یوں ہی ادب لطیف کا سالنامہ اٹھا لایا۔ اس میں سب ہی کے مضمون یا افسانے تھے جو آج اس قدر مشہور ہیں احمد علی، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، فیض، مجاز وغیرہ۔

اس وقت تک میں ان میں سے احمد علی کے سوا کسی کے نام سے نہیں واقف تھا لُطف یہ ہے کہ مخدوم محی الدین میرے ہم جماعت اور میری طرح مولوی عبدالحق صاحب کے شاگرد تھے، یہ وہیں رہتے تھے اور ایک زمانہ ایسا آیا ہے کہ اپنی ہر تازہ نظم سب سے پہلے مجھی کو سناتے جاتے تھے۔ میں ان کی شاعری کا قائل بھی بہت تھا لیکن وہ بھی نئے ادیبوں اور نئی ادبی تحریک کا ذکر کم ہی کرتے تھے۔

بد قسمتی یہ ہے کہ یونیورسٹیوں کے پروفیسر اردو ادب اور خصوصاً جدید اردو ادب کی بے بضاعتی سے کچھ اتنے مطمئن ہیں اور اس زمانے میں اتنے زیادہ مطمئن تھے کہ کوئی نئی

چیز پڑھنا بہت ہی نچلے درجے قسم کا مشغلہ سمجھتے تھے۔ اسی دھوکے میں میں نے بھی اُس وقت تک اردو کے ان نئے ادیبوں کی چیزیں نہیں پڑھی تھیں۔ لیکن جب میں ادب لطیف کا یہ سالنامہ ختم کر چکا تو مجھے کچھ یہ احساس ہوا کہ میں اونگھتا ہی رہ گیا اور زندگی میرے قریب سے ہو کے گزر گئی اور مجھے پیچھے چھوڑ گئی۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں کشمیر سے واپس ہوتے ہوئے لاہور میں چند گھنٹوں کے لئے قیام ہوا۔ اس وقت نکال کے مکتبۂ اردو پہنچا۔ سالنامے کے جو مصنفین پسند آئے تھے ان کی کتابیں خریدیں۔ وہیں بدقسمتی سے چوہدری رشید احمد صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اور "ہوس" کی اشاعت کا معاملہ طے کیا۔ اور چوہدری صاحب باوجود میرے اصرار اور خوشامد کے "ہوس" کو تیسری مرتبہ اور "مر اور خون" کو دوسری مرتبہ چھاپنے پر تلے ہوئے ہیں۔ مجھے ان دونوں ناولوں کو اپنا کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یہ دونوں طالب علمی کے زمانے کی چیزیں ہیں۔ اس میں انکسار کو دخل نہیں۔ اور یوں مجھ میں انکسار کی صلاحیت بھی بہت کم ہے۔

جو کتابیں میں نے مکتبۂ اردو سے خریدی تھیں وہ اور ان کے مصنفوں کی اور جتنی کتابیں مجھے جہاں ملیں میں نے پڑھیں اور پھر ان پہ ایک مضمون "ترقی پسند ادب" کے نام سے ان کے جائزے کے طور پہ سالۂ اردو میں لکھ مارا۔ یہ کتابی صورت میں بھی چھپ چکا ہے لیکن ان مصنفوں کو پڑھنے کے بعد "گریز" کی تکمیل کا میں نے قطعی ارادہ کر لیا۔ ۱۹۴۳ء کے کشمیر کے سفر میں میں وہ ابواب اپنے ساتھ لیتا گیا جو کئی سال پہلے لکھے تھے۔ اور ناول کی تکمیل کر ہی ڈالی۔ یہ پہلا ناول ہے جس کو اپنا کہتے ہوئے مجھے شرم نہیں آتی۔ کئی لحاظ سے

میں اس کو اپنا سب سے کامیاب ناول سمجھتا ہوں۔ اس پر عام اعتراض جو کیا جاتا ہے لیعنی عریانی کا وہ خالص مشرقی ہے۔ "گریز" میں اور بہت سی چیزیں ہیں ۱۹۳۷ء کے قریب یورپ کی سیاست ہرتشا کا کردار چیکوسلواکیا، نفسیاتِ شباب اور اس پر طنز، اور کچھ اچھے خاصے فقرے۔ مجھے حیرت ہے کہ پڑھنے والوں کی نظر صرف عریانی پر کیوں پڑتی ہے اور یورپ کے جدید ادب کا کون سا ایسا ناول ہے جس میں عریانی نہیں۔

بہت سے نقادوں نے فوراً میرا سلسلہ ڈی ایچ۔ لارنس سے ملا دیا۔ میں نے لارنس کی سب کہانیاں پڑھی ہیں مگر "لیڈی چیٹرلی کے عاشق" کے سوا اس کا کوئی اور ناول اتفاق سے نہیں پڑھا۔ جس زمانہ میں میں پڑھ رہا تھا ڈی ایچ۔ لارنس کا فیشن ختم ہو چکا تھا آلڈس ہکسلے اور ای۔ ایم۔ فارسٹر کی مقبولیت بہت بڑھ گئی تھی۔ انگریزی ناول نگاروں میں میں انہیں دو سے بہت متاثر ہوا ہوں اور اب بھی متاثر ہوں۔ ہکسلے سے تکنیک کی حد تک۔ اس کے علاوہ ہکسلے نے NOVEL OF IDEAS کے فن کو تو ماس مان سے لے کر طنز کی چاشنی میں جس طرح ڈبویا ہے اسی کا مجھ پر سب سے زیادہ اثر ہے۔ ہکسلے کے یہاں عریانی جتنی بھی ہے طنزیہ ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے لوئی اراگاں کے یا ژاں پال سارتر کے یا آرتھر کوئسلر کے یا الکسی ٹالسٹائے کے دلچسپ ہوں یا راست کے عریانی سب کے یہاں بہت ہے) ناولوں میں عریانی طنزیہ ہے۔ کیا کیا جائے فرائڈ نے نہ صرف انسانی جسم کے بلکہ انسانی روح تک کے کپڑے اتار لئے اور اسے برہنہ کر دیا۔ انتہائی چپ کے مارکسی ناول نگار بھی جب متوسط طبقے کی زندگی بیان کرنے لگتے ہیں تو باوجود فتوائے تکفیر

متوسط طبقہ کے اس غسّال زنگ منڈ فرائڈ سے اپنے تجزیے کا پہلو بچا نہیں سکتے اور پھر وہی طنزیہ عریانی۔ ڈی ایچ لارنس کے ناولوں میں عریانی عبادت ہے۔ ایسی عبادت جو بیماری بھی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بالواسطہ ڈی ایچ۔ لارنس کا اثر آلڈس ہکسلے پر ہوا ہے اور ہکسلے کے توسط سے اس بیماری کے جراثیم کچھ مجھ تک پہنچے ہوں۔ فارسٹر کا اثر بادی النظر میں اتنی آسانی سے نظر نہیں آتا کیونکہ وہ زیادہ مہذب ہے۔ اس لئے لباس پہنے ہے۔ اور مشرقی ناظر کی نظر سب سے پہلے عریانی پر پڑتی ہے لیکن فارسٹر کا اثر مجھ پر بہت گہرا رہا ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ صرف کتابی نہیں یہ ذاتی بھی ہے۔ اور یہ ایک طرح کا فلسفہ حیات ہے۔ فارسٹر نے اپنے ناولوں اور تحریروں میں "ذاتی تعلقات" کا نظریہ پیش کیا ہے یعنی دو افراد خواہ وہ کتنی ہی مختلف اور مخالف قوموں یا نسلوں سے تعلق رکھتے ہوں اگر آپس میں ایک دوسرے سے اپنی دوستی برقرار رکھیں اور چاہے جو کچھ ہو جائے اس میں فرق نہ آنے دیں تو اس بدنصیب انسانیت اور اس مائل بہ فنا دنیا کے لئے امید باقی ہے۔ اسی نظریہ "گریز" کی بنیاد ہے۔ جہاں اس میں ہر ہر قدم پر زندگی سے گریز ہے، وہاں یہ اثباتی پہلو بھی اجاگر کیا گیا ہے کہ نعیم اور ہرشا اور کراکسلے کی دوستی۔ اور جذباتی سطح پر نعیم کا بلقیس سے عشق جو آخر میں بے غرض ہو جاتا ہے، زندگی سے اس مسلسل گریز کا توڑ اور اس کا علاج ہیں۔

"آگ" سے میں مطمئن نہیں ہوں۔ کشمیر کی وادی کے مسلمانوں کی زندگی کو میں نے باہر سے دیکھا ہے، اگرچہ کہ ان سے ملنے جلنے، ان کے شادی و غم میں شریک ہونے، ان کے ساتھ

لیل و نہار گزارنے کے مجھے بہت مواقع ملے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں اردو کشمیر کو جدید اردو ادب میں بہت غلط پیش کیا گیا ہے۔ شکست "کے کرداروں کی زندگی، ان کا لباس ان کے خیالات، ان کی زبان ممکن ہے پونچھ کے رہنے والوں کے ہوں لیکن نہ کرشن چندر اور نہ رامانند ساگر (حالانکہ وہ پکے کشمیری ہیں) کے کسی افسانے میں کشمیری مسلمانوں کے اصلی خدوخال واضح ہوتے ہیں۔ کرشن چندر کے افسانوں میں تو معلوم ہوتا ہے کہ سینکڑوں ہزاروں نوراں، نورمیشاں قسم کی کشمیری لڑکیاں محض اس انتظار میں جہلم کے کنارے، پہل گام کی گھاٹی اور پیر پنجال کی چوٹیوں پر کھڑی ہیں کہ کرشن چندر کے افسانوں کے بدمعاش ہیرو پھینک کے انہیں تاریک کے جھونپڑیوں میں لے جائیں یا انہی افسانوں کے ہیرو شبنم سے منہ دھو کے برف سے دانت مانجھ کے ان کے لب لعلیں کے بوسے لیں۔ "آگ" میں کشمیری مسلمان گھرانوں کا بیان بڑا "خارجی" سا ہو گیا ہے۔ اور ناول کے ابتدائی حصے میں بیانیہ عنصر قصہ پر بھاری ہو گیا ہے۔ اس کا آخری حصہ بڑی عجلت میں لکھا گیا۔ ناول کا معاہدہ شیخ نذیر احمد مرحوم مالک تاج آفس سے ہوا تھا ہر ہفتہ ان کا تقاضہ کا خط آتا کہ ناول کو جلدی مکمل کیجئے۔ آخری حصے میں کرداروں کی خاطر خواہ نشوونما نہ ہو سکی میں سکندر جو کے مرض الموت کو خصوصاً زیادہ تفصیل سے بیان کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا وقت نہ ملا بہت سے کردار غیر ضروری آگئے ہیں جن کی نشوونما نہ ہو سکی۔ مگر وہ سب کے سب زندگی سے لئے گئے ہیں۔ نقش ابھر نہ سکے۔ اور یہ بھی عجلت ہی کی وجہ سے۔

"ایسی بلندی ایسی پستی" میں نے ۱۹۴۷ء میں لکھا۔ یہ ایک خاندان کی سرگذشت

ہے۔ اسے ایک طرح کا "شجریاتی" Genealogical ناول کہہ لیجئے۔ موضوع وہی ہے جو فارسایٹ ساگا کا رہ چکا ہے۔ حقِ ملکیت جو جائداد اور سرمایہ کے ساتھ بطور ایک تصور اور ایک عمل کے نافذ ہوا اور حقیقت میں کسی عورت کے دل یا اس کے حسن کو نہیں خرید سکتا۔ اس ناول میں بھی طنز بہت زیادہ ہے لیکن مشرق کی رعایت سے عریانی تقریباً بالکل نہیں رکھی گئی ہے اور جنس بھی بہت کم۔ رسوائی کے جو افسانے ہیں وہ اس لئے ہیں کہ اس جاگیردارانہ نظام کی پیداوار اونچے متوسط طبقے کا وجود ہی نوعِ انسانی کے لئے باعثِ رسوائی ہے۔

"ایسی بلندی ایسی پستی" مسلسل نہیں لکھا گیا۔ اور نہ پہلے سے (کاغذ پر) اس کا کوئی خاکہ تیار کیا گیا۔ ایک خاکہ ذہن میں محفوظ تھا جس بار کے لئے طبیعت موزوں ہوئی پہلے اسی کو لکھ ڈالا۔ اس شجریاتی ناول میں "وقت" کے فریب کو بھی توڑنا تھا اور صرف سریندر کی خود کلامیوں میں نہیں ناول کی بنیادی تکنیک میں۔ کیونکہ ڈرامائی لمحے وقت کی ہموار اور غیر دلچسپ سطح کے اوپر یوں ابھرتے ہیں جیسے دھند کے اوپر کسی پہاڑ کی برفانی چوٹیاں ان ڈرامائی لمحوں کی علیت ثانوی چیز ہے۔ علیت کا تسلسل قائم رکھنے میں لگے رہنے تو کبھی ڈرامائی لمحہ ہی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ برفانی چوٹیوں کی بلندی جب موسم اچھا ہوتا ہے فوراً آپ لی گئی۔ ان کا باہم فاصلہ، تو جغرافیہ کی چیز ہے ــــ ڈرامائی لمحوں کی حد تک یہ وقت کے پیمانوں گھنٹوں، دنوں، ہفتوں، مہینوں اور برسوں کی چیز ہے۔ جو محض فاصلے ہیں۔ اور انہیں ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔

بدستر از گناہ

اس شجر باقی ناول میں پہلے پس منظر دیا گیا ہے کشن پلی کی پہاڑیاں۔ پھر ایک خاندان جس کا طرب اور حزن بیر ڈرامہ۔ جس حد تک طرب یا حزن متوسط طبقے میں ممکن ہے کیونکہ اور ہر چیز کی طرح طرب اور حزن میں بھی متوسط طبقہ ارسطو کے نظریۂ اعتدال کو صدیوں تک سینے سے لگائے رہا ۔۔۔ ونسل پہلے سے شروع ہوتا ہے۔ پھر آخری پڑ کے بیان میں کینوس کو ذرا وسیع کر کے تمام بہن بھائیوں کا تفصیلی حال ایک باب میں ہے ان میں سے ایک بہن ہیروئن بنانے کے لیے چن لی گئی ہے۔ جو اس خاندانی ماحول کے بیان کے بعد ایک کانی بالذات کردار کے طور پر ابھرتی ہے اور اس کی شادی کے ساتھ شوہر کے جائز اور ناجائز حق ملکیت کا قصہ چھڑ جاتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں وہی اُلجھن کے "گڑیا کے گھر" اور گالزوردی کے" صاحب جائداد" کا موضوع۔ لیکن الجھن کی گڑیا اور گالزوردی کا صاحبِ جائداد پہلی جنگ عظیم سے پہلے ہی ناروے اور انگلستان میں اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ مشرق میں جسم کی ملکیت معلوم نہیں ابھی اور کتنی صدیوں تک رہے گی۔ موضوع وہ رس کا سہی مسئلہ اور مشاہدہ اپنے ہی معاشرے کا ہے۔

بجائے الجھن یا گالزوردی کی طرح کوئی حل پیش کرنے کے ۔۔۔ حل تو سب ہی کو معلوم ہے۔ سریندر کا کردار پیش کر کے اس پوری روئیداد پر جا بجا تبصرہ کیا گیا ہے۔ اور تبصرہ کی تکنیک فراطنز میں ڈوبے ہوئے شعور کی رو کی ہے اور اندرونی خود کلامی کی جو ابھی تک فرسودہ نہیں ہو پائی۔ اس طرح سریندر اس ناول میں وہی کام انجام دیتا ہے

هــوس

جو یونانی ڈرامہ میں کورس انجام دیتا تھا۔ روئیداد کے عمل پر تبصرے کے۔
میں صرف چند سطروں میں یہ عذر کرنا چاہتا تھا کہ میرے منع کرنے کے باوجود
"اپنے جوشِ تجارت" میں چوہدری رشید احمد صاحب "ہوس" اور "مرمر اور خون"
کو شائع کرنا چاہ رہے ہیں۔ یہ میری مرضی کے بالکل خلاف ہے۔ میری مرضی کے
مطابق یہ ہوگا کہ جو ناول میں نے متابلتاً سنِ شعور میں لکھے یعنی گریز، آگ، اور ایسی
بلندی ایسی پستی، انہیں لوگ پڑھیں اور ان کی تعریف کریں۔ کول سیبر کی پوپ
نے یہ کہہ کر ہنسی اڑائی تھی کہ مسخرے کو زندہ رہنے کے لئے اپنا عذرِ حیات" لکھنا
پڑا۔ یہی حال میرے عذرِ گناہ کا ہے ۔۔۔ مگر اب کیا کیا جائے۔

عزیز احمد

محمد شفیع خوشنویس

ر (ناجی پریس لاہور)